شاہی خزانہ
جالو جگاؤ
نونہال ادب

شاہی خزانہ

محمد سعید اختر

نونہال ادب

ہمدرد فاؤنڈیشن پریس کراچی

اسلم کی عمر دس سال تھی اور وہ پانچویں کلاس کا طالبِ علم تھا۔ اُس کے والد صابر حسین ایک ڈاک خانے میں پوسٹ مین تھے۔ وہ صُبح گھر سے نکلتے اور سارا دِن لوگوں کو خطوط، منی آرڈر اور پارسل وغیرہ پہنچاتے رہتے۔ صابر حسین کے والد بھی یہی کام کرتے تھے۔ اُن کی جگہ صابر حسین نے سنبھال لی تھی اور اب پچھلے دس، گیارہ برس سے وہ اپنی ڈیوٹی انجام دے رہے تھے۔

وہ غریب آدمی تھے اور غریب لوگوں کے بہت سے مسائل ہوتے ہیں۔ وہ بھی ہر وقت پریشان رہتے تھے۔ تنخواہ بھی معمولی تھی اور معمولی تنخواہ میں گزارا بڑی مشکل سے ہوتا تھا۔ وہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے دُعا مانگتے کہ کسی طرح اُن کے

مسائل حل ہو جائیں اور اُن کے پاس بھی بہت ساری دولت آ جائے۔ وہ کبھی سوچتے کہ کاش انہیں کہیں سے الہٰ دین کا جادوئی چراغ مل جائے کہ رگڑتے ہی ایک جن حاضر ہو جو آتے ہی کہے: "بول میرے آقا، کیا حکم ہے؟" اور وہ فوراً اسے ڈھیر ساری دولت لانے کا حکم دے دیں، لیکن یہ سب دعائیں بچکانہ تھیں جن کا حقیقت کی دُنیا سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ وہ تو بس خواب تھے۔ جھوٹے اور دل فریب خواب۔

اسلم سے چھوٹا ایک بھائی سلیم اور سلیم سے چھوٹی صفیہ تھی۔ وہ جب مختلف چیزوں کے لیے ضد کرتے تو صابر حسین کو اور بھی زیادہ دُکھ ہوتا، وہ سوچتے کاش وہ اپنے بچوں کی خواہشیں پوری کر سکتے۔ کاش ان کے پاس پیسے ہوتے۔

ایک روز صابر حسین حسب معمول ڈاک تقسیم کر رہے تھے۔ ایک گھر سے دوسرے گھر، ایک گلی سے دوسری گلی وہ ڈاک تقسیم کرتے چلے جا رہے تھے خطوط، پارسل، منی آرڈر۔ پھر وہ ایک عمارت کے سامنے پہنچے۔ اس وقت ان

کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا پیکٹ تھا۔ صابر حسین کا خیال تھا کہ اس پیکٹ میں کوئی کتاب وغیرہ ہو گی۔ وہ خاکی کاغذ میں لپٹی ہوئی تھی اور اس پر جو پتا لکھا تھا وہ اسی عمارت کا تھا، جس شخص کے نام یہ پیکٹ تھا اس کا نام جمال مرزا تھا۔ صابر حسین نے گھنٹی بجانے کے لیے بٹن تلاش کرنے کے لیے نظریں دوڑائیں تو اُنہیں احساس ہوا کہ اندر کوئی نہیں ہے۔ کیوں کہ گیٹ پر تالا جھُول رہا تھا۔ اُنہوں نے کُچھ دیر کُچھ سوچا، پھر برابر والی عمارت کی طرف بڑھ گئے اور گھنٹی بجائی۔ تھوڑی دیر بعد ایک صاحب باہر نکلے۔ صابر حسین اس شخص کو نام سے جانتے تھے۔ اُنہوں نے کہا۔

”صدیقی صاحب، یہ آپ کے برابر والی عمارت میں جو صاحب رہتے ہیں آپ بتا سکتے ہیں کہ وہ کہاں گئے ہیں؟“

صدیقی صاحب نے کہا: ”یہاں ایک صاحب رہتے تھے جمال مرزا، مگر پچھلے ہفتے سے اُن کا کوئی پتا نہیں ہے۔ اللہ جانے کہاں چلے گئے۔ کُچھ بتا کر بھی نہیں گئے،

مگر آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

صابر حسین نے جواب دیا: "اُن کے نام یہ پیکٹ آیا تھا مگر اب تو۔۔۔!"

صدیقی صاحب بولے: "شاید بھیجنے والے کا نام لکھا ہو۔"

صابر حسین نے پیکٹ اُلٹ پلٹ کر دیکھا مگر بھیجنے والے کا کوئی نام و پتا اس پیکٹ پر درج نہیں تھا اور نہ ہی یہ پیکٹ رجسٹرڈ تھا۔ اُنہوں نے کہا: "اس پر تو کسی بھیجنے والے کا نام نہیں ہے۔ یہ تو مسئلہ پیدا ہو گیا ہے۔"

صدیقی صاحب بولے: "آپ تین چار دِن بعد دوبارہ دیکھ لیجیے گا۔ شاید وہ اس دوران آجائیں۔"

"ہوں، ٹھیک ہے۔ اچھّا شکریہ۔۔۔ اللہ حافظ!" صابر حسین نے کُچھ سوچتے ہوئے کہا اور پھر بے خیالی میں وہ پیکٹ اپنی خاکی وردی کی جیب ڈال لیا۔ اِس کے بعد وہ دوسرے خطوط تقسیم کرنے لگے۔ سہ پہر کے قریب وہ تمام ڈاک تقسیم

کر کے ڈاک خانے پہنچے اور اس کے بعد ضروری اندراجات وغیرہ کرنے کے بعد اپنی ڈیوٹی ختم ہونے کے بعد اپنے گھر لوٹے۔

گھر آ کر اُنہوں نے کپڑے تبدیل کیے اور پھر ایک پلنگ پر آ بیٹھے۔ تینوں بچّے، اسلم، سلیم اور صفیہ بھی اُن کے پاس آ گئے اور اُن سے باتیں کرنے لگے۔ صابر حسین بھی مزے لے لے کر اُنہیں چھیڑتے رہے اور ہنساتے رہے۔ اس دوران سلیم نے کہا: "ابو ہم پھل لائیں گے، پیسے دیجیے۔"

"اچھّا۔۔۔۔ اچھّا۔" یہ کہہ کر اُنہوں نے اُن کی ماں کو آواز دی اور کہا کہ ذرا میری وردی کی جیب میں سے پیسے تو نکال لاؤ۔

اسلم کی ماں رضیہ بیگم نے کھونٹی پر ٹنگی ہوئی قمیص اُتار کر اس کی جیب میں ہاتھ ڈالا تو اس کے ہاتھ میں ایک پیکٹ آ گیا۔ وہ پیکٹ کو گھورتی رہی پھر دوسری جیب سے پیسے نکال کر وہ صابر حسین کے پاس آئی اور پیکٹ دکھاتے ہوئے بولی: "یہ کس کا پیکٹ لے آئے؟"

صابر حسین نے چونک کر اُس پیکٹ کی طرف دیکھا اور پھر کہا "اُفّوہ! یہ تو میں ڈاک خانے میں جمع کرانا بھول ہی گیا۔"

پھر اُنہوں نے کہا۔ "لاؤ مجھے دو، میں صُبح جمع کرادوں گا۔"

رضیہ بیگم نے پیکٹ اُنہیں دے دیا۔ صابر حسین نے پیکٹ اپنے برابر میں پلنگ پر ڈال دیا اور پھر کُچھ پیسے سلیم کو دیتے ہوئے بولے۔ "جاؤ اسلم بھائی کے ساتھ جا کر پھل لے آؤ۔"

اسلم سلیم کو لے کر باہر نکل گیا۔ اس دوران رضیہ بیگم نے صابر حسین سے کہا کہ وہ کھانا کھالیں۔

صابر حسین ہاتھ مُنہ دھونے کے لیے اُٹھ گئے۔ صفیہ وہیں پلنگ پر بیٹھی تھی اُس نے پیکٹ سے کھیلنا شروع کر دیا جو صابر حسین نے رکھا تھا۔

صابر حسین جب مُنہ ہاتھ دھو کر واپس آئے تو ایک دم چونک پڑے۔ کیوں کہ

پیکٹ کے اوپر کا خاکی کاغذ پھٹا پڑا تھا اور صفیہ ایک سُرخ رنگ کی نوٹ بُک سے کھیل رہی تھی۔ صفیہ نے کھیلتے ہوئے اوپر کا کاغذ پھاڑ دیا تھا۔

صابر حسین نے جھپٹ کر وہ نوٹ بُک صفیہ کے ہاتھ سے چھین لی۔ اُنہیں افسوس ہوا کہ اُن کی ذرا سی بے پروائی اور بے توجہی سے پیکٹ پھٹ گیا۔ اُنہوں نے صفیہ کو اُس کی ماں کے حوالے کیا اور پھر خود پلنگ پر بیٹھ کر کھانا کھانے لگے۔

اِس دوران اسلم اور سلیم بھی باہر سے کھیل لے کر آ گئے اور وہ سب ماں کے ساتھ مصروف ہو گئے۔ صابر حسین نے کھانا کھا کر پانی پیا اور کھانے کے برتن اٹھا کر باورچی خانے میں رکھ آئے۔ پھر دوبارہ پلنگ پر آ بیٹھے اور اُنہوں نے وہ سُرخ نوٹ بُک اُٹھالی۔ اُنہوں نے سوچا کہ یقیناً اِس میں نوٹ بُک بھیجنے والے کا نام پتا لکھا ہو گا۔ اِس خیال سے اُنہوں نے نوٹ بُک کے صفحات اُلٹے۔ پہلے صفحے پر ایک شخص کا نام لکھا تھا:

پروفیسر کرامت بیگ!

نام کے ساتھ تعلیمی ڈگری بھی لکھی تھی اور اُس کے نیچے ایک ریسرچ ادارے کا
پتا تھا جو پشاور میں قائم تھا۔

نوٹ بُک میں جگہ جگہ مختلف حساب کتاب لکھا تھا جس پر سُرخ نشان سے کراس
لگا ہوا تھا۔ اِس کا مطلب یہ تھا کہ یہ سب بے کار ہے۔ پھر ایک جگہ اُنہیں ایک
نقشہ نظر آیا۔ نقشہ دیکھ کر صابر حسین کی آنکھوں میں عجیب سی چمک آ گئی۔
اُنہوں نے جلدی سے دوسرا صفحہ پلٹا، وہاں جمال مرزا کے نام ایک خط لکھا ہوا
تھا۔ صابر حسین نے تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ خط پڑھنا شروع کیا۔ لکھا تھا:

”جمال بیٹے! اُمّید ہے تُم خیریت سے ہو گے۔ کافی عرصے سے تمہاری کوئی
خیریت کی خبر نہیں آئی۔ اپنی خیریت سے مطلع کرتے رہا کرو۔ میری طبیعت اِن
دِنوں ٹھیک نہیں ہے۔ یوں بھی بڑھاپا تو سو بیماریوں کی ایک بیماری ہے۔ بہر حال
یہ نوٹ بُک میں تمہیں اس لیے بھیج رہا ہوں کہ اِس میں ایک خفیہ خزانے کا نقشہ
ہے۔ نقشے کے مطابق اُس خفیہ جگہ پر قیمتی ہیرے جواہرات دفن ہیں۔ یہ

ہیرے جواہرات مُغلیہ دور سے تعلّق رکھتے ہیں اور جو کُچھ مُجھ تک اِن کی کہانی پہنچی ہے وہ یہ ہے کہ کُچھ ڈاکوؤں نے شاہی خاندان کے کسی فرد کو لوٹ کر یہ ہیرے جواہرات حاصل کیے اور پھر گرفتاری کے خوف سے اِس خفیہ مقام پر چھپادیے اور اس جگہ کا نقشہ بنا کر اپنے پاس رکھ لیا تھا تاکہ حالات سازگار ہوتے ہی وہ ہیرے وہاں سے نکال کر فروخت کر سکیں، لیکن پھر اُن ڈاکوؤں کا کُچھ پتا نہیں چلا۔ شاید کسی واردات کے دوران کُچھ مارے گئے اور کُچھ کہیں بھاگ گئے اور وہ ہیرے جواہرات وہیں دفن رہے۔

جڑی بوٹیوں کی تلاش میں جب پچھلے دِنوں میں وادیوں اور گھنے جنگلات کی خاک چھان رہا تھا تو ایک جنگل میں پوشیدہ غار میں سے مُجھے یہ نقشہ اِتّفاقاً پڑا ہوا ملا۔ غار میں ایک انسانی ڈھانچہ بھی تھا جو شاید برسوں پرانا تھا اور شاید یہ انہی ڈاکوؤں میں سے کوئی تھا۔ شاید وہ کسی زہریلے جانور کے کاٹنے سے ہلاک ہو گیا ہو یا کسی اور شدید بیماری اور حادثے کا شکار ہوا ہو۔ بہر حال مُجھے یقین ہے کہ وہ ابھی ڈاکوؤں میں سے ایک تھا اور حادثے کا شکار ہو کر یہاں غار میں مر گیا۔ نقشے کا کاغذ بھی

بہت بوسیدہ تھا۔ جگہ جگہ سے پھٹ رہا تھا۔ میں نے احتیاطاً اِس نقشے کو اُس نوٹ بُک میں اُتار لیا۔ مُجھے خزانوں وغیرہ سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔ اس لیے یہ نقشہ تمہیں بھیج رہا ہوں، تم ابھی جوان آدمی ہو، شاید تمہیں اِن ہیرے جواہرات کی ضرورت پڑے۔ میں تو اب ویسے بھی بُوڑھا ہو چکا ہوں۔ نقشے میں تمام تفصیلات درج ہیں۔ اگر تُم تلاش میں نکلو گے تو بڑی آسانی سے وہاں تک پہنچ جاؤ گے۔

بہر حال، ہو سکے تو مُجھ سے آکر ایک بار مل جاؤ۔ اب میں ریٹائر بھی ہو چکا ہوں۔

فقط تمہارا چچا

کرامت بیگ

صابر حسین کے دِل کی دھڑکنیں خط پڑھ کر بہت تیز ہو گئیں، اُن کا سانس پھولنے لگا جیسے وہ میلوں دوڑ کر آئے ہوں اور آنکھیں چمک اُٹھیں۔ اُنہیں ایک

دم یوں لگا کہ جیسے قدرت نے اُنہیں گھر بیٹھے چھپّر پھاڑ کر دولت دے دی ہے۔
اب وہ بھی ایک مال دار آدمی ہوں گے۔ وہ نوکری چھوڑ دیں گے اور پھر ٹھاٹ
سے رہیں گے۔ ان کے بچے اعلیٰ تعلیم حاصل کریں گے، شاندار زندگی گزاریں
گے اور ان کی ہر ضد پوری ہو گی۔

صابر حسین دیر تک وہ نوٹ بُک ہاتھ میں پکڑے حسین وادیوں میں بھٹکتے رہے۔
اُنہوں نے سوچا کہ جہاں مرزا غائب ہے اور کرامت بیگ کو خزانے کی ضرورت
نہیں ہے اور قدرت نے یہ اسی لیے مُجھ تک پہنچایا ہے کہ اب اس پر میرا حق
ہے۔ میں یہ خزانہ ضرور تلاش کروں گا۔

اُنہوں نے نقشے کو غور سے دیکھا مگر اُس پر تو نشانات لگے تھے اور جن جگہوں کے
نام لکھے تھے وہ ان کے بارے میں بالکل بھی نہیں جانتے تھے۔ وہ کبھی اپنے شہر
سے باہر بھی نہیں نکلے تھے۔ پھر وہ تو کسی پہاڑی علاقے کا نقشہ تھا اور پہاڑی
علاقوں کے بارے میں تو وہ بالکل بھی نہیں جانتے تھے۔ ایسے میں اُنہیں اپنے

دوست سلطان کا خیال آیا۔

سلطان اُن کا بہت پرانا دوست تھا، بہت چالاک اور تیز۔ وہ ایک پہاڑی علاقے کا رہنے والا تھا اور اُس نے میٹرک تک صابر حسین کے ساتھ تعلیم حاصل کی تھی۔ پھر اپنے باپ کے انتقال پر وہ واپس اپنے علاقے میں چلا گیا اور اُس کے بعد سال چھ مہینے میں وہ صابر حسین سے ملنے آتا رہا۔ البتّہ اِس مرتبہ وہ پچھلے ایک سال سے نہیں آیا تھا۔ سلطان سے وہ تینوں بچّے بھی بہت مانوس تھے کیوں کہ وہ جب بھی اُن کے گھر آتا تھا ان کے لیے ٹافیاں اور کھلونے ضرور لاتا تھا۔

چناں چہ صابر حسین نے سوچا کہ اس سِلسِلے میں سلطان کی مدد لینی چاہیے۔ وہ ان کا پرانا دوست بھی ہے اور پہاڑی علاقوں سے اچھّی طرح واقف بھی ہے۔ یہ سوچ کر وہ سلطان کو اُس کے دیے ہوئے پتے پر خط لکھنے بیٹھ گئے۔

عزیز دوست سلطان! السّلام علیکم!

اُمّید ہے کہ آپ بالکل خیریت سے ہوں گے، کافی دِنوں سے آپ کی کوئی خیریت نہیں معلوم ہوئی۔ آپ سے ایک ضروری معاملے میں مشورہ کرنا ہے۔ آپ فوراً آ جائیں۔ یہ معاملہ بہت اہم ہے اور اگر آپ نے میرا ساتھ دیا تو ہم بہت امیر اور مال دار ہو سکتے ہیں۔ میں خط میں تمام باتیں نہیں لکھ سکتا۔ خط پڑھتے ہی فوراً آ جایئے۔ میں شدّت سے آپ کا انتظار کروں گا۔ گھر میں سب کو سلام کہیے گا۔

فقط

آپ کا دوست صابر حسین

خط مکمل کرنے کے بعد اُنھوں نے لفافے میں بند کیا اور پھر لفافہ اپنی وردی میں رکھ لیا۔ اس کے بعد وہ پلنگ پر لیٹ گئے مگر نیند اُن کی آنکھوں سے کافی دور

تھی۔ گُمشدہ خزانہ اُن کی آنکھوں میں گھومتا رہا اور وہ کروٹیں بدلتے رہے۔

تینوں بچّے سو چکے تھے۔ رضیہ بیگم بھی اپنے بستر پر لیٹ گئی تھی مگر صابر حسین کو چین نہیں آرہا تھا۔ اُنہوں نے وہ نوٹ بُک اپنے تکیے کے نیچے رکھ لی تھی۔ اُنہیں ڈر تھا کہ وہ کہیں گُم نہ ہو جائے۔

صُبح اُنہوں نے ڈاک خانے پہنچتے ہی سب سے پہلے سلطان کو خط رجسٹری کے ذریعہ سے روانہ کیا۔ پھر دوسرے روزمرہ کے کاموں کی طرف متوجّہ ہوئے، خط چھانٹی کرنا، اُنہیں ایک ترتیب سے رکھنا، کُچھ اندراجات کرنا، رجسٹریاں، وی پی اور منی آرڈر الگ کرنا۔ اس کے بعد وہ حسبِ معمول ڈاک تقسیم کرنے کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ لیکن آج اُن کی چال میں وہ تیزی اور پھُرتی نہیں تھی۔ آج اُن کا اِس کام میں بالکل بھی دِل نہیں لگ رہا تھا، وہ تو آج یہ سوچ رہے تھے کہ بس چند دِنوں کا اور ہے یہ کام، اُس کے بعد تو وہ بہت امیر اور مال دار ہو جائیں گے۔ پھر اُنہیں یوں دھوپ اور گرمی میں مارے مارے نہیں پھرنا پڑے گا۔

وہ آرام سے کسی ائیر کنڈیشنڈ کمرے میں بیٹھے ہوں گے۔انہیں کوئی کاروبار کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہو گی بس وہ تو خوب مزے کریں گے۔

جب صابر حسین ڈاک تقسیم کرتے ہوئے اُس سڑک پر آئے جہاں جمال مرزا کا گھر تھا تو اُن کا دِل بہت تیزی سے دھڑکنے لگا۔اُنہوں نے سوچا کہ وہاں سے کترا کر گزر جائیں مگر آج صدیقی صاحب کا ایک خط آیا ہوا تھا اور وہ ہر حالت میں پہنچانا تھا۔اُنہوں نے جھجکتے ہوئے صدیقی صاحب کے مکان کی گھنٹی بجائی۔

صدیقی صاحب لہراتے ہوئے باہر نکلے اور صابر حسین کو دیکھ کر اُن کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔

”ارے آؤ صابر حسین، آج کیا لے آئے؟“

صابر حسین نے خط اُن کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا!”یہ آپ کا خط آیا ہے۔ رجسٹری ہے، یہاں رسید پر دستخط کر دیجئے۔“

صدیقی صاحب نے خط لے کر رسید پر دستخط کر دیے۔ پھر کہنے لگے "بھئی جمال مرزا کا ابھی تک پتا نہیں چلا۔ معلوم نہیں کیا بات ہے۔"

صابر حسین نے کہا شاید ایک دو روز میں آ جائیں۔

"ہاں، شاید،" یہ کہہ کر وہ واپس مڑ گئے۔

صابر حسین نے جلدی سے اپنے قدم آگے بڑھا رہے۔ اُن کے ماتھے پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے اور دِل ابھی تک بہت تیز دھڑک رہا تھا۔

یہ تیسرے دِن کی بات ہے کہ جب سلطان اُن کے گھر آیا۔ سلطان ایک صحت مند، طاقت ور اور بارُعب شخص تھا۔ آتے ہی اُس نے پوچھا: "صابر حسین خیریت تو ہے۔ آخر ایسی کیا بات ہوئی جو تم نے یوں خط لکھ کر بُلایا؟"

صابر حسین نے کہا۔ "بات ہی کُچھ ایسی ہے، مگر وعدہ کرو کہ تم کسی اور سے اس کا ذکر نہیں کرو گے۔"

"ارے تُم بھی کیسی بات کرتے ہو، صابر حسین۔" سلطان نے بگڑ کر کہا۔ "جو بات ہمارے درمیان ہو گی وہ کسی تیسرے کو پتا نہیں چلے گی۔ میری جان چلی جائے گی مگر میں اپنی زبان سے ایک لفظ نہیں کہوں گا۔"

"شکریہ سلطان! دراصل بات ہی ایسی ہے کہ ہم دونوں کے علاوہ اور کسی کو معلوم نہیں ہونا چاہیے۔"

"اچھّا بابا! اب بتاؤ بھی۔" سلطان نے زِچ ہو کر کہا۔

صابر حسین نے کہا۔ "بات یہ ہے سلطان کہ کُچھ دِنوں پہلے میں ایک پتے پر ایک پیکٹ دینے گیا تو معلوم ہوا کہ وہ شخص کئی دِنوں سے غائب ہے۔ میں نے بے خیالی میں وہ پیکٹ اپنی جیب میں ڈال لیا۔ گھر آ کر مُجھے پتا چلا کہ وہ پیکٹ میری جیب میں ہی موجود ہے، میں نے وہ پلنگ پر ڈال دیا کہ صُبح جاتے ہوئے ڈاک خانے لے جاؤں گا مگر پھر اتّفاق سے صفیہ نے وہ پیکٹ پھاڑ دیا۔ اس کے اندر سے ایک سُرخ نوٹ بک نکلی اور پتا ہے اس سُرخ نوٹ میں کیا تھا؟"

”کیا تھا صابر حسین؟“ سلطان جلدی سے بولا۔

صابر حسین نے زبان ہونٹوں پر پھیری اور پھر کہا۔ ”اُس میں ایک نقشہ تھا، خزانے کا نقشہ۔“

”کیا خزانے کا نقشہ۔“ سلطان حیرانی سے بولا۔

”ہاں خزانے کا نقشہ“

”کہاں ہے وہ؟ مُجھے دکھاؤ۔“ سلطان بے تابی سے بولا۔ ”ابھی دکھاتا ہوں۔“ صابر حسین نے کہا اور پھر ایک الماری سے اُنھوں نے وہی سُرخ نوٹ بک نکالی۔

سلطان نے جھپٹ کر نوٹ بُک پکڑی اور اس کے صفحات اُلٹنے لگا۔ جلد ہی اس کی آنکھوں کے سامنے خزانے کا نقشہ تھا۔ خزانے کا نقشہ دیکھ کر اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک آگئی۔ صابر حسین نے اُسے وہ خط بھی دِکھایا جو کسی کرامت بیگ نے جمال کو لکھا تھا۔ پھر اُنھوں نے پوچھا:

"سلطان کیا تُم نے نقشہ سمجھ لیا؟ کیا تم اُس جگہ پہنچ سکتے ہو؟"

"ہاں۔۔۔ ہاں، کیوں نہیں۔ میں بڑی آسانی سے وہاں پہنچ جاؤں گا۔ یہ علاقہ میرا دیکھا ہوا ہے۔" سلطان نے جواب دیا اور صابر حسین نے اطمینان کا سانس لیا۔

سلطان ابھی تک نقشے پر جھکا ہوا تھا، صابر حسین نے کہا۔ "پھر ہمیں آج سے ہی تیّاری شروع کر دینی چاہیے۔"

"ہاں، تم صحیح کہتے ہو۔ ہمیں اب زیادہ دیر نہیں کرنی چاہیے۔ ہم کل سفر پر روانہ ہو جائیں گے۔" سلطان نے جواب دیا۔

صابر حسین سفر کی تیّاری کرنے لگے۔ دوسرے دِن وہ دفتر سے ایک ہفتے کی چھٹّی لے کر روانہ ہوئے۔ صابر حسین نے رضیہ بیگم اور اپنے بچّوں سے کہا کہ وہ ایک ضروری کام سے لاہور جا رہے ہیں، ایک ہفتے میں واپس آجائیں گے۔

اسلم نے ضد کی۔ "ابّو اہم بھی آپ کے ساتھ چلیں گے۔"

صابر حسین نے کہا۔ "نہیں بیٹا، ہم آپ کو ساتھ نہیں لے جا سکتے۔ ہمیں بہت ضروری کام ہے۔ ہم آپ کے لیے لاہور سے بہت اچھّے اچھّے کھلونے لائیں گے اور کہانیوں کی کتاب بھی۔۔۔۔ اور پھر ہم بعد میں آپ کو لاہور کی سیر کرالائیں گے۔" اسلم اپنے ابّو کی بات سُن کر خاموش ہو گیا۔ پھر وہ سب کو اللہ حافظ کہہ کر رُخصت ہوئے۔

وہ دونوں ریلوے اسٹیشن پر آئے۔ سلطان نے پشاور کے ٹکٹ پہلے ہی بُک کروا لیے تھے۔ گاڑی آنے پر وہ ڈبّے میں چڑھے اور اپنی سیٹیں تلاش کر کے بیٹھ گئے۔

اسٹیشن پر لوگوں کا ہجوم تھا۔ صابر حسین کھڑکی سے سر باہر نکالے لوگوں کو دیکھتے رہے۔ وہ بہت خوش تھے اور بار بار اُس خزانے کے متعلّق سوچنے لگتے تھے کہ جس کی تلاش میں وہ جا رہے تھے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ خزانہ ملتے ہی وہ بہت

مال دار ہو جائیں گے۔ پھر وہ ایک عالی شان گھر بنوائیں گے۔ اُن کے پاس بہت سی خوب صورت گاڑیاں ہوں گی۔ اُن کے بچّوں کے لیے بہترین، اور شان دار کھلونے ہوں گے۔ پہننے کے لیے اعلیٰ اور خوب صورت ملبوسات ہوں گے۔ مزے مزے کے کھانے کھایا کریں گے۔ اِس کے علاوہ وہ ہوائی جہاز میں بیٹھ کر بہت سے ملکوں کی سیر کرنے جائیں گے اور کوئی شان دار اور بہت بڑا کاروبار کریں گے۔ اُن کا بڑا سا آفس ہو گا جس میں وہ سب سے بڑے افسر بن کر بیٹھا کریں گے۔ ان کے ہاں بہت سے لوگ ملازم ہوں گے۔

صابر حسین اِسی قسم کی باتیں سوچتے رہے۔ بالکل شیخ چلّیوں کی طرح جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھتے رہے۔

تھوڑی دیر بعد گاڑی نے سیٹی بجائی اور چھک چھک کرتی چلنے لگی۔ پھر رفتہ رفتہ اُس کی رفتار میں تیزی آتی گئی۔ پھر وہ ایک مخصوص رفتار سے دوڑنے لگی۔ اسٹیشن کی عمارت دور رہ گئی۔ پھر ٹرین شہر کی حدود سے باہر نکل گئی اور اب جنگل

اور میدانوں کا سِلسِلہ شروع ہو گیا۔ سلطان اخبار ہاتھ میں پکڑے بیٹھا تھا۔ وہ بھی شاید خزانے کے متعلّق سوچ رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں بھی بڑے بڑے خواب تھے۔

حیدر آباد اسٹیشن پر جب ٹرین ٹھیری تو اُنہوں نے کُچھ پھل خرید لیے۔ اس کے بعد وہ رات کا کھانا کھانے لگے۔ ٹرین وہاں سے بھی روانہ ہو گئی۔ صابر حسین پھر کھڑکی سے باہر دوڑتے ہوئے مناظر دیکھنے لگے۔ رات ہو گئی تھی مگر چاند نکلا ہوا تھا اور اُس کی مدھم چاندنی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔

صابر حسین بیٹھے بیٹھے اونگھنے لگے۔ پھر گاڑی کے جھٹکوں اور ہوا کے ٹھنڈے جھونکوں نے اُنہیں نیند کی آغوش میں پہنچا دیا۔ وہ بیٹھے بیٹھے ہی سو گئے سلطان بھی اونگھنے لگا تھا۔

ٹرین چھک چھک کرتی آگے بڑھتی رہی۔ صابر حسین سیٹ سے سر ٹِکائے سوتے رہے۔ پھر اِسی عالم اُنہیں عجیب و غریب خواب نظر آنے لگے۔ اُنہیں یوں لگا کہ

جیسے وہ ایک جنگل میں جا رہے ہیں۔ رات کا وقت ہے اور سارا جنگل خوف ناک آوازوں سے گونج رہا ہے۔ وہ اُن آوازوں سے بچنے کے لیے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونسے اِدھر اُدھر بھاگ رہے ہیں مگر یہ آوازیں ہر طرف سے آ رہی ہیں اور پھر دفعتاً اُنہیں چاروں طرف سے خوف ناک جنوں اور بھُوتوں نے گھیر لیا۔ وہ اُنہیں اپنے بڑے بڑے بالوں بھرے ہاتھوں سے پکڑنے کے لیے اُن کی طرف بڑھے۔ اُن کے مُنہ سے خوف ناک آوازیں نکل رہی تھیں اور اُن کے چہرے بہت بھیانک تھے۔ خوف اور دہشت کے مارے وہ چیخنے لگے مگر آواز اُن کے گلے میں ہی گھُٹ کر رہ گئی۔ پھر اِس سے پہلے کہ وہ خوف ناک جنّات اُنہیں دبوچتے، کہیں سے ایک خوب صورت پری نمودار ہوئی۔ پری کے ہاتھ میں ایک سنہری چھڑی تھی۔ اُس نے اُس شہری چھڑی کو اُن جنوں اور بھُوتوں کی طرف کیا اور اُس میں سے سنہری شعاعیں نکلنے لگیں۔ وہ جادُو کی چھڑی تھی۔ اُن شعاعوں کو دیکھتے ہی تمام جن اور بھُوت ایک دم غائب ہو گئے۔

اب وہاں صرف پری تھی جو اُنہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ اپنی نرم آواز میں بولی

"گھبراؤ نہیں اے آدم زاد۔ وہ سب شیطان کے چیلے بھاگ گئے ہیں۔ وہ اب دوبارہ نہیں آئیں گے۔ آؤ میں تمہیں تمہارے گھر چھوڑ آؤں۔" پری نے اُن کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس کے ساتھ ہی خواب کا منظر بدل گیا۔ اُنہوں نے دیکھا کہ وہ ایک عالی شان محل میں ایک بہت بڑے تخت پر بیٹھے ہیں جس میں ہیرے جواہرات اور قیمتی موتی جڑے ہوئے ہیں۔ اُن کے ارد گرد باندیاں اور غلام ہاتھ باندھے کھڑے ہیں۔ قریب ہی اُن کے بچّے ہیں۔ ان کی بیوی بھی ملکہ بنی بیٹھی ہے۔ لوگ آرہے اور وہ سب کو ہیرے جواہرات اور اشرفیاں انعام میں دے رہے ہیں۔

پھر اچانک منظر بدلا اور اُنہوں نے دیکھا کہ وہ ایک جنگل میں سے گزر رہے ہیں۔ راستہ بہت گنجان اور خار زار ہے۔ وہ جھاڑیوں میں راستہ بناتے چلے جارہے ہیں۔ اُن کے ہاتھ زخمی ہو چکے ہیں۔ اور کپڑے تار تار ہیں۔ اُن کے پیروں میں چھالے پڑ چکے ہیں۔ پیاس کے مارے ان کی زبان پر کانٹے سے پڑ رہے ہیں اور ان کے سر پر مُردار خور گِدھ پرواز کر رہے ہیں۔ پھر ایک جانب سے ایک

عجیب و غریب جانور نکلا اور پھر اپنے خوف ناک پنجوں سے اُن پر حملہ کر دیا۔

صابر حسین چیخ مار کر ایک دم جاگ اٹھے۔ اُنہوں نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا تو نہ وہ جنگل تھا اور نہ وہ خوف ناک جانور بلکہ وہی ریل، وہی ڈبّا تھا اور وہی لوگ۔۔۔۔ اور سلطان اُن سے پوچھ رہا تھا:

"کیا ہوا؟ کیا ہوا صابر حسین، کیا کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ لیا؟"

"ہاں، شاید!" وہ اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے بولے۔

"اچھّا یہ لو! تُم پانی پیو اور پھر اوپر برتھ پر آرام سے لیٹ کر سو جاؤ۔" سلطان نے قریب رکھے کولر میں سے اُنہیں پانی کا گلاس بھر کر دیتے ہوئے کہا۔

صابر حسین نے پانی کا گلاس لے کر ایک ہی سانس میں خالی کر دیا اور پھر اوپر برتھ باہر جا کر لیٹ گئے۔ اُنہوں نے سونے کے لیے آنکھیں بند کیں اور تب اُن کے ذہن میں دوبارہ وہ خوف ناک خواب گھومنے لگا۔ وہ اِس خواب کے

متعلّق سوچنے لگے۔ اُن کا دل بہت تیز دھڑک رہا تھا۔ ریل گاڑی اپنی مخصوص رفتار سے دوڑ رہی تھی۔ دوسرے دِن کوئی سہ پہر کے وقت گاڑی جب ایک چھوٹے سے قصبے پر رُکی تو وہ نیچے اتر آئے۔ وہ اپنا سامان اٹھا کر اسٹیشن سے باہر آئے اور پھر ایک تانگے میں بیٹھ کر ایک سرائے میں پہنچے اور ایک کمرا لے کر آرام کرنے کے لیے لیٹ گئے۔

اس قصبے سے آگے سونار جنگل تھا۔ خاصے وسیع رقبے پر پھیلا ہوا ایک گھنا جنگل اور اسی جنگل میں کسی خفیہ جگہ پر وہ خزانہ دفن تھا جو ڈاکوؤں نے شاہی خاندان کے لوگوں کو لوٹ کر چھپایا تھا۔ صابر حسین اور سلطان نے اگلے دِن کا پروگرام بنایا۔ اُنہیں صُبح سویرے سرائے سے نکلنا تھا۔ اُنہیں اُمّید تھی کہ سرائے سے اُنہیں خچّر یا گدھے سواری کے لیے مل جائیں گے اور شاید شام تک وہ اس خزانے کو حاصل کرنے میں کام یاب ہو جائیں گے۔

وہ دونوں کافی دیر تک پروگرام بناتے رہے۔ شام کو وہ قصبے میں ٹہلنے نکلے۔ وہ

زیادہ بڑا قصبہ نہیں تھا۔ اُنھوں نے خود کو طبیب بتایا جو جڑی بوٹیوں کی تلاش میں سونار جنگل میں جانا چاہتے تھے۔ ایک آدمی سے اُنھوں نے ایک خچّر اور ایک گدھا کرائے پر حاصل کیا اور تھوڑا بہت ضروری سامان خریدا۔ پھر وہ دوبارہ سرائے میں آ گئے۔ رات کا کھانا اُنھوں نے سرائے میں ہی کھایا، کھانا کھانے کے بعد وہ جلد ہی سونے کے لیے لیٹ گئے تا کہ صُبح جلد ہی اٹھ کر دوبارہ سفر شروع کر سکیں۔

ساری رات وہ دونوں سوتے جاگتے رہے، بار بار وہ اس خزانے کے متعلّق سوچنے لگتے جو اب جلد ہی اُنہیں مل جانے والا تھا۔ یہ خزانہ اُن کی قسمت، اُن کی زندگی پلٹ سکتا تھا۔

صُبح جب مُرغ بانگ دے رہے تھے تو وہ دونوں اُٹھ گئے۔ اُن کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ ساری رات چین سے نہیں سو سکے ہیں۔ اُنھوں نے جلدی جلدی اپنی تیّاری مکمّل کی اور پھر سامان اٹھا کر باہر آ گئے۔

سرائے کے مالک کو اللہ حافظ کہا اور خچّر اور گدھے پر بیٹھ کر وہ سونار جنگل کی طرف بڑھ گئے۔ جب سورج نکل آیا تو ایک جگہ رُک کر اُنہوں نے ناشتا کیا۔ اس کے بعد دوبارہ سفر شروع کیا، جیسے جیسے وہ آگے بڑھتے جا رہے تھے جنگل اور بھی گھنا ہوتا جا رہا تھا۔ خود رَو جھاڑیاں بار بار ان کا راستہ روک لیتی تھیں۔ اُنہیں سفر کرنے میں سخت تکلیف محسوس ہو رہی تھی مگر کُچھ پانے کے لیے بہت سی تکلیفیں برداشت کرنی ہی پڑتی ہیں۔

دوپہر تک وہ بغیر رُکے نقشے کے مطابق سفر کرتے رہے۔ پھر ایک چھوٹی سی ندی کے کنارے کُچھ دیر آرام کرنے کے لیے بیٹھ گئے۔ وہاں اُنہوں نے دوپہر کا کھانا کھایا جو وہ اپنے ساتھ لائے تھے۔ کھانا کھا کر وہ لیٹ گئے۔

صابر حسین نے کہا۔ ”کیا خیال ہے ہم شام تک اس جگہ پہنچ جائیں گے۔“

”ہاں۔۔۔۔ ابھی تک ہم بالکل صحیح راستے پر جا رہے ہیں۔ چھے سات بجے تک ہم اس جگہ تک پہنچ جائیں گے۔“ سلطان نے جواب دیا۔

پھر اُس نے پوچھا۔ ”صابر حسین تُم نے اِس نقشے اور خزانے کا کسی اور سے تو ذکر نہیں کیا تھا۔“

”نہیں۔ میں نے کسی کو بھی نہیں بتایا۔ بس تمھیں خط لکھا تھا۔“

”اس کا مطلب ہے اِس خزانے کے بارے میں تمہارے اور میرے علاوہ اور کسی کو نہیں معلوم!“

”ہاں، یقیناً!“ صابر حسین نے کہا۔ ”مگر کیا کوئی گڑبڑ والی بات ہے؟“

”نہیں اب کوئی گڑبڑ والی بات نہیں ہے۔ اگر تُم کسی اور کو بتا دیتے تو پھر گڑبڑ ہو سکتی تھی۔“ سلطان نے جواب دیا۔

پھر خاموشی چھا گئی۔ اچانک کسی آہٹ سے سلطان چونک کر اُٹھ بیٹھا۔ اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ پھر اُسے چار آدمی نظر آئے۔ اُن کی پیٹھ پر چھوٹے چھوٹے تھیلے لٹکے ہوئے تھے اور وہ جھکے جھکے آگے بڑھ رہے تھے۔ سلطان سنبھل کر بیٹھ

گیا۔ صابر حسین نے بھی اُن چاروں کو دیکھ لیا تھا اور اُس کی آنکھوں میں خون اور ڈر کی پرچھائیں لہرانے لگیں۔ ”السّلام علیکم!“ اُن چاروں نے قریب آکر بیک وقت کہا۔

”وعلیکم السّلام!“ صابر حسین نے بیٹھی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ سلطان اُنہیں خاموشی سے گھورتا رہا۔

”آپ کون لوگ ہیں؟“ اُن میں سے ایک نے پوچھا۔

صابر حسین نے جواب دینے کے لیے مُنہ کھولا ہی تھا کہ سلطان نے جلدی سے کہا۔ ”پہلے آپ بتائیں کہ آپ لوگ کون ہیں اور یہاں جنگل میں کیا کر رہے ہیں؟“

ایک شخص نے جو عمر میں سب سے زیادہ لگ رہا تھا اور اس کی آنکھوں پر مُوٹے شیشوں کی عینک لگی تھی آگے بڑھ کر کہا:

”بہت خوب ! چلیں پہلے ہم ہی اپنا تعارف کرا دیں۔ میرا نام طلعت مرزا ہے اور میں ایک طبّی ادارے میں جڑی بوٹیوں پر ریسرچ کرتا ہوں، یہ میرے اسسٹنٹ اور شاگرد ہیں۔ ہم یہاں مختلف جنگلی جڑی بوٹیوں کی تلاش میں آئے ہیں۔ ٹھیک !اب آپ بتایئے آپ لوگ کون ہیں اور یہاں کیا کر رہے ہیں ؟“

سلطان نے جلدی سے کہا۔ ”ہم لوگ بھی آپ ہی کی طرح ہیں، بس فرق یہ ہے کہ ہم اپنی ضرورت کے مطابق ایک خاص قسم کی بوٹی کی تلاش میں ہیں۔ دراصل ہم لوگ حکیم ہیں اور اپنے چند مریضوں کے لیے یہ بوٹی تلاش کر رہے ہیں ؟“

”اوہ۔۔۔۔ اچھّا، اچھّا! آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔“ یہ کہہ کر طلعت مرزا نے ہاتھ بڑھایا۔

سلطان نے بھی ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”ہمیں بھی آپ سے مل کر خوشی ہوئی ہے۔“

پھر ان سب نے ایک دوسرے سے ہاتھ ملایا۔ اِس کے بعد طلعت مرزا اور اس کے ساتھی بھی وہاں بیٹھ گئے۔

طلعت مرزا نے پوچھا۔ ”کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ وہ بوٹی کون سی ہے۔ کوئی خاص نشانی ہے اُس کی؟ ہو سکتا ہے میں آپ کی کُچھ مدد کر سکوں۔“

سلطان نے کہا۔ ”ہاں، ہاں کیوں نہیں۔ وہ ایک چھوٹی سی بوٹی ہوتی ہے۔ چار پا پانچ انچ لمبی۔ اُس کے سِرے پر کاسنی رنگ کے بالکل چھوٹے چھوٹے سے ریشے ہوتے ہیں اور اُس کی شاخ گہری بھوری رنگ کی ہوتی ہے۔ بالکل نرم اور لچک دار۔ اُس کے اندر سے پیلا پیلا پانی سا رِستا رہتا ہے۔ یہ بوٹی ایک خاص بیماری کے کام آتی ہے۔ اِس بیماری کو ہم کوئی نام نہیں دے سکے۔ بس، اُس کی خاص نشانی یہ ہوتی ہے کہ اس میں مریض کے پورے جسم میں شدید درد ہوتا ہے اور وہ آہستہ آہستہ سوکھنے لگتا ہے۔ جو کُچھ کھاتا ہے وہ واپس باہر آ جاتا ہے۔ کوئی چیز ہضم نہیں ہوتی اور جسم کی رنگت بھی سیاہ ہونے لگتی ہے۔“

سلطان اِس طرح تفصیل بتاتا چلا گیا کہ جیسے وہ واقعی حکیم ہو۔ طلعت مرزا بھی دِل چسپی سے اُس کی باتیں سُن رہا تھا۔ سلطان کے خاموش ہوتے ہی بولا:

"حیرت انگیز بیماری ہے۔ افسوس کہ ایسی بوٹی میری نظر سے نہیں گزری شاید پہاڑی کے دوسری طرف ہو۔ اِس طرف ہمارا ابھی تک جانا نہیں ہوا؟"

"ہاں، ہمیں بھی دو دِن ہو گئے اِس علاقے میں بھٹکتے ہوئے۔ اب اُسی طرف جائیں گے۔ دراصل ہمیں بھی اِس بوٹی کے بارے میں ایک قدیم نسخے سے پتا چلا تھا اور اُس میں اِس بات کی طرف بھی نشان دہی کی گئی ہے کہ یہ کِن علاقوں مل سکتی ہے۔"

"اللہ آپ کو کام یاب کرے۔" طلعت مرزا نے کہا۔ پھر پوچھا:

"اچھا آپ لوگوں نے کھانا کھالیا یا نہیں؟"

"جی نہیں، ہم کھانا کھا چکے ہیں۔" سلطان نے جواب دیا۔

"بھئی ہم تو ابھی تک کھانا نہیں کھا سکے۔" طلعت مرزا نے کہا اور پھر اپنے تھیلے میں سے کھانے کا سامان نکالنے لگا۔ اُس کے تینوں ساتھی بھی کھانے کی تیّاری کرنے لگے۔ کھانے کے دوران وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ سلطان اور صابر حسین پھر لیٹ گئے تھے مگر وہ خاصے بے چین تھے۔ اُن کی خواہش تھی کہ یہ لوگ طلعت مرزا اور اُس کے ساتھی جلد سے جلد یہاں سے چلے جائیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ اُن کے ساتھ ہی چپک جائیں۔ وہ دِل ہی دِل میں اُن سب کے چلے جانے کی دُعائیں مانگتے رہے۔ مگر شاید اُن کی قسمت خراب تھی کہ کھانا کھانے سے بعد طلعت مرزا نے اُنہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"جناب! کیا خیال ہے ہم سب ساتھ مل کر جڑی بوٹیاں کیوں نہ تلاش کریں۔ اب ہمیں بھی اِس بوٹی کو دیکھنے کا شوق پیدا ہو گیا ہے جس کی تلاش میں آپ لوگ ہیں۔"

سلطان نے جلدی سے کہا۔ "مرزا صاحب، آپ کیوں ہماری وجہ سے آپ لوگ

پریشان ہوتے ہیں۔ آپ اپنا کام کیجیے۔ ہم خود ہی تنہا تلاش کرلیں گے۔"

"نہیں، نہیں۔ اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ بھئی یہ تو ہمارے فائدے کی ہی بات ہے۔ ہم لوگوں کا تو تعلّق ہی ایسے ادارے سے ہے جو نئی نئی بوٹیوں کی تلاش اور اُن پر ریسرچ کرتا ہے۔ ہو سکتا ہے ہم سب مل کر آسانی سے وہ بوٹی تلاش کرلیں۔"

سلطان خاموش ہو گیا اور صابر حسین نے کہا۔ "ٹھیک ہے جناب، جیسی آپ لوگوں کی مرضی۔"

طلعت مرزا نے کہا۔ "پھر ہم لوگ تھوڑا آرام کرلیں۔ اس کے بعد آگے بڑھیں گے۔"

سب خاموش ہو کر لیٹ گئے۔ سلطان اور صابر حسین سخت پریشان اور فکر مند ہو گئے تھے اور سوچ رہے تھے کہ یہ خواہ مخواہ کی مُصیبت گلے لگ گئی۔ اب ان سے

کسی طرح پیچھا چھڑایا جائے۔ جب تک یہ ساتھ ہیں وہ لوگ خزانہ نہیں نکال سکیں گے۔ سلطان تو دِل ہی دِل میں خوب پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ اور طلعت مرزا اور اُس کے ساتھیوں کو کوس رہا تھا۔

کوئی ایک گھنٹہ آرام کرنے کے بعد وہ سب اُٹھ بیٹھے اور پھر اگلے سفر کی تیّاری کرنے لگے۔ اب وہ سب ایک ساتھ بوٹی کی تلاش میں تھے۔ طلعت مرزا اور اُس کے ساتھی تو بڑی دِلچسپی اور لگن سے وہ نامعلوم بوٹی تلاش کر رہے تھے مگر سلطان اور صابر حسین زبردستی اُن کا ساتھ دے رہے تھے۔ وہ تو جانتے تھے کہ اُنھوں نے جو بوٹی اُنہیں بتائی ہے اُس کا کوئی وجود نہیں ہے۔ اِس لیے تلاش کرنا بے کار ہی ہے مگر وہ یہ بات اُنہیں نہیں بتا سکتے تھے اور اب وہ مجبوری میں اُن کے ساتھ گھِسٹ رہے تھے اور کوئی ایسی ترکیب سوچ رہے تھے کہ اُن سے نجات پا سکیں۔

جب اندھیرا پھیلنے لگا تو اُنھوں نے ایک مناسب سی جگہ دیکھ کہ رات وہاں

گزارنے کا فیصلہ کیا۔ چھولداریاں نصب کر دی گئیں اور وہ سب رات کا کھانا کھا کر اپنی اپنی چھولداریوں میں سونے کے لیے چلے گئے۔ طلعت مرزا نے سلطان اور صابر حسین سے کہا کہ وہ اُن سے تفصیلی گُفتگو کرنا چاہتا ہے مگر اُن دونوں نے جواب دیا کہ وہ سخت تھک گئے ہیں اور اُن کے سر میں درد ہو رہا ہے۔ اِس وجہ سے وہ آرام کرنا چاہتے ہیں۔ چناں چہ مجبوراً طلعت مرزا بھی اپنی چھولداری میں چلا گیا۔

آدھی رات کے وقت جب سب گہری نیند میں تھے تو سلطان اور صابر حسین نے اپنا سامان سمیٹا اور پھر خاموشی کے ساتھ اندھیرے جنگل میں غائب ہو گئے۔ صُبح جب طلعت مرزا اور اس کے ساتھیوں کی آنکھ کھُلی تو اُنہوں نے دونوں کو غائب پایا۔ طلعت مرزا نے حیرت سے کہا۔ ”یہ لوگ کہاں غائب ہو گئے۔ آخر یہ بتا کر کیوں نہیں گئے!“

ایک ساتھی بولا۔ ”جناب! وہ دونوں بڑے پُر اسرار آدمی تھے۔ ضرور وہ کسی

خاص کام پر نکلے تھے اور ہمارا ساتھ انہیں پسند نہیں تھا۔"

"ہاں، شاید یہی بات ہو۔" طلعت مرزا نے کہا۔ "لیکن کم سے کم اُنہیں بتا کر تو جانا چاہیے تھا۔ ہم اُنہیں زبردستی روک تو نہیں لیتے۔"

"اچھّا ہوا سر وہ لوگ چلے گئے۔ ورنہ پتا نہیں، ہم بھی کسی مصیبت میں پھنس جاتے۔"

طلعت مرزا سوچ میں ڈوب گیا۔

سلطان اور صابر حسین صُبح ہونے تک اُن لوگوں سے بہت دور نکل گئے تھے اور اب وہ اس جگہ سے بہت قریب تھے کہ جہاں ڈاکوؤں نے خزانہ چھپایا تھا۔ کوئی بارہ بجے کے قریب وہ اُس غار کے قریب پہنچ گئے۔ غار کا دہانہ جھاڑیوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ اُنہوں نے جھاڑیاں ہٹائیں اور پھر اندر قدم رکھا۔ وہ ایک خاصا بڑا غار تھا اور سورج کی روشنی وہاں تک پہنچ رہی تھی۔

اُن کے دِل دھڑک رہے تھے اور وہ چوکنے انداز میں قدم قدم آگے بڑھ رہے تھے۔ پھر غار کے دوسری طرف وہ باہر نکل آئے۔ وہاں ایک چھوٹا سا پانی کا چشمہ بہہ رہا تھا۔ قریب ہی ایک چٹان کے ساتھ پی کا ایک گھنا درخت کھڑا تھا جس کا تنا بہت چوڑا تھا اور جس کی شاخیں زمین کو چھُو رہی تھیں۔ سلطان بے اختیار اُس درخت کی طرف دوڑا۔ اب تک تمام نشانیاں درست جا رہی تھیں۔ نقشے میں جس غار اور پھر جس درخت کی طرف اشارہ کیا گیا تھا وہ اب اُن کے سامنے تھا۔ اِسی درخت سے دس قدم کے فاصلے پر شمال کی طرف دو فیٹ زمین کے اندر وہ خزانہ دفن تھا۔

صابر حسین بھی اب بہت زیادہ جوش میں تھے۔ اُن کے اندر ہیجان سا برپا تھا اور اُن کی خواہش تھی کہ بس جلد سے جلد وہ خزانہ نکال لیں۔ دراصل ابھی تک اُنہیں مکمل طور پر یقین نہیں تھا کہ وہ خزانہ وہاں موجود ہے۔ ابھی وہ اِسی شش و پنج میں تھے کہ پتا نہیں یہ سب کُچھ جھوٹ ہو اور ان کی ساری محنت بے کار رہ جائے۔

سلطان بھی جلد از جلد اِس سسپنس کو ختم کر دینا چاہتا تھا۔ چناں چہ اُس نے فوراً اپنا سامان ایک طرف پھینکا اور درخت کے قریب پہنچ کر احتیاط سے شمال کی طرف دس قدم گن کر اُٹھائے۔ جب دس قدم پورے ہو گئے تو وہ رُک گیا۔ وہاں جھاڑ جھنکار اُگا ہوا تھا اور کسی بھی قسم کے آثار نہیں تھے۔ صابر حسین بھی اُس کے قریب آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ پھر سلطان نے لپک کر اپنے سامان سے ایک سلاخ نکالی۔ یہ نوکیلی سلاخ تھی، کوئی ڈیڑھ فٹ لمبی اور ایک انچ موٹی۔ اُس نے اِس سُلاخ کی مدد سے وہاں کھدائی شروع کر دی۔ سلطان کو زمین کھودتے دیکھ کر صابر حسین نے بھی اپنے سامان میں سے ویسی ہی ایک سلاخ نکالی اور پھر خود بھی سلطان کے ساتھ زمین کھودنے لگے۔

دونوں کے ہاتھ مشینی انداز میں چل رہے تھے۔ حالاں کہ وہ بہت زیادہ تھکے ہوئے تھے، مگر اِس وقت اُن میں اتنا جوش تھا کہ وہ ساری تھکن بھول گئے تھے۔ بس اب تو وہ جلد سے جلد خزانہ حاصل کر لینا چاہتے تھے۔

وہ کھدائی کرتے رہے۔ چوں کہ سلاخیں زیادہ بڑی اور موٹی نہیں تھیں اِس وجہ سے کھدائی کرنے میں مشکل پیش آرہی تھی مگر انہیں اِس کی پروانہیں تھی۔ پھر دفعتاً صابر حسین کو سلاخ کے کسی چیز سے ٹکرانے کی آواز آئی۔ وہ دونوں چونک کر رُک گئے اور اُس گڑھے کو دیکھنے لگے۔ وہ تقریباً چار فیٹ چوڑا اور چار فیٹ لمبا گڑھا کھود رہے تھے اور اب تک وہ دو فیٹ کے قریب کھود چُکے تھے۔

سلطان اپنی جگہ سے صابر حسین کی طرف آیا اور پھر اُس نے جھک کر دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ وہ دونوں دھول اور مٹّی میں اَٹ گئے تھے اور سارے کپڑے پسینے کی وجہ سے جسم سے چپک کر رہ گئے تھے مگر اُنہیں اِس کی پروانہیں تھی۔ پھر سلطان نے جھُک کر ہاتھوں سے گڑھے کی مٹّی صاف کی اور مٹّی صاف کرتے ہی اُنہیں ایک لوہے کا بھاری اور چوکور سا صندُوق نظر آیا۔ اُنہوں نے جلدی جلدی اُس کے چاروں طرف سے مٹّی کی کھدائی کر کے اُسے باہر نکالا۔ وہ اب بڑی طرح سے ہانپنے لگے تھے۔ اُن کی آنکھوں میں خوشی اور مسرّت کے ساتھ ساتھ شدّتِ جذبات سے آنسو آ گئے تھے۔ صابر حسین پر تو

عجیب ہیجان کی سی کیفیت طاری ہو گئی تھی اور جیسے وہ بہکنے لگے تھے۔ پھر اِسی سرشاری میں وہ ناچنے لگے۔ وہ اِس وقت بالکل بچّے بن گئے تھے جنہیں کوئی من پسند کھلونا مل جائے تو وہ خوشی سے جھوم اُٹھتے ہیں۔

سلطان بھی بہت خوش تھا۔ پھر اُس نے سلاخ سے اُس کے کُنڈے میں لگا تالا توڑ ڈالا اور جب اُس نے ڈھکن ہٹایا تو اُن کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اندر بیش قیمت ہیرے جواہرات جھلمل جھلمل کر رہے تھے۔ ہار، سر پر پہننے والے چھوٹے چھوٹے تاج، ہاتھوں کے خوب صورت کڑے، جِن میں ہیرے جڑے ہوئے تھے۔ اِس کے علاوہ سونے چاندی کے سِکّے بھی تھے جو یقیناً اشرفیاں تھیں۔

دونوں مبہوت ہو کر اس خزانے کو دیکھتے رہے۔ پھر اسے بند کر کے اُنہوں نے ایک جھاڑی میں رکھا اور وہ گڑھا بند کر دیا۔ صندوق زیادہ بڑا نہیں تھا۔ ڈیڑھ فٹ چوڑا اور ڈیڑھ فٹ لمبا ہو گا اور ڈیڑھ فِٹ ہی اُس کی گہرائی ہو گی۔

پھر اُنہوں نے غار میں آ کر کُچھ دیر آرام کیا۔ جب تھکن اتری تو چشمے کے قریب آ کر وہ اچھّی طرح نہائے اور دوسرے کپڑے بدل کر اُنہوں نے کھانا کھایا۔ کھانے کے دوران سلطان نے کہا:

"صابر حسین، اس طرح صندوق لے جانا تو ٹھیک نہیں رہے گا۔ کیوں نہ ہم یہ سارا خزانہ دو تھیلوں میں بھر لیں؟"

صابر حسین نے جواب دیا۔ "ہاں، ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔ اِس طرح ہم آسانی سے اُٹھا بھی سکیں گے۔"

"تو پھر بقیہ فالتو سامان ہم یہیں چھوڑ جاتے ہیں تا کہ سفر میں ہمیں آسانی رہے۔" سلطان بولا۔

"جیسے تمہاری مرضی۔" صابر حسین نے کہا اور اِس کے بعد وہ خزانے کو دو تھیلوں میں بھرنے لگے۔ یہ مضبوط کپڑے کے تھیلے تھے جو وہ اپنے ساتھ لے کر

چلے تھے۔ اِن تھیلوں میں خزانہ بھر کر وہ نکل جانا چاہتے تھے۔

صابر حسین پُر جوش تھے اور وہ تیز تیز قدم اٹھا رہے تھے۔ اُن کی آنکھوں میں خوشی کے ساتھ ساتھ بہت سارے خواب تھے اور وہ آنے والے دِنوں کے بارے میں ڈھیر سارے پلان بنا رہے تھے جبکہ سلطان کے دِل میں ایک نیا خیال جنم لے رہا تھا۔ اُس کے اندر لالچ کا اژدہا پھنکارنے لگا تھا۔ وہ ایک بالکل نئے انداز سے سوچ رہا تھا۔

رات ہوئی تو اُنہوں نے ایک مناسب جگہ دیکھ کر پڑاؤ ڈالا اور کھانا وغیرہ کھا کر سونے کی تیّاری کرنے لگے۔

سلطان نے کہا۔ ”صابر حسین اِس جنگل میں خطرناک جانور بھی ہیں اور پھر اب ہمارے پاس خزانہ بھی ہے۔ اِس لیے ہمیں اِس کی حفاظت کے لیے پہرا دینا چاہیے۔ ایسا کرتے ہیں کہ آدھی رات میں پہرا دیتا ہوں اور آدھی رات تم۔“

صابر حسین نے کہا۔ ”ٹھیک ہے۔ پھر پہلے میں پہرا دوں۔“

سلطان نے کہا۔ ”نہیں، پہلے تم سو جاؤ۔ میں جاگتا رہوں گا۔ آدھی رات کے بعد میں تمہیں اُٹھا دوں گا۔“

”جیسے تمہاری مرضی۔“ صابر حسین نے کہا اور سونے کے لیے لیٹ گیا۔

سلطان پہرا دینے لگا۔ صابر حسین سخت تھکے ہوئے تھے۔ جلد ہی گہری نیند میں ڈوب گئے۔ سلطان خاموشی سے بیٹھا ہوا صابر حسین کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ چاند کی مدھم روشنی میں صابر حسین کا چہرہ صاف نظر آ رہا تھا۔ سوتے میں اُن کے ہونٹ مُسکرا رہے تھے جیسے وہ کوئی بہت اچھّا خواب دیکھ رہے ہوں۔

سلطان کُچھ دیر اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ پھر اچانک وہ اپنی جگہ سے اٹھا۔ اُس وقت اُس کی آنکھوں میں خُون اُترا ہوا تھا اور اُس کی سانس تیز تیز چل رہی تھی۔ اُس نے خود سے کہا: ”اِس خزانے کا میں مالک ہوں۔ اِس میں کسی کا حصّہ نہیں ہونا چاہیے۔ یہ

سارے کا سارا میرا ہے، صرف میرا۔"

وہ آہستہ آہستہ صابر حسین کی طرف بڑھا۔ اُس کے ہاتھ پھیلے ہوئے تھے۔ پھر وہ بالکل صابر حسین کے چہرے پر جھک گیا۔ صابر حسین کے خرّاٹے گونج رہے تھے اور وہ گہری نیند میں تھے۔

سلطان نے اپنے ہاتھ صابر حسین کی گردن کی طرف بڑھائے اور پھر اُس نے صابر حسین کی گردن دبوچ لی۔ صابر حسین نے ایک دم ہڑبڑا کر اُٹھنے کی کوشش کی مگر سلطان اُن کے سینے پر چڑھ بیٹھا اور پھر پوری قوّت سے صابر حسین کی گردن دبانے لگا۔ صابر حسین نے دونوں ہاتھوں سے اُسے ہٹانے کی کوشش کی مگر سلطان نے پوری طاقت سے اُنہیں دبا رکھا تھا۔ اُس کے ہاتھوں کا دباؤ صابر حسین کے گلے پر بڑھتا جا رہا تھا۔ صابر حسین ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ اُن کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا، دم گھُٹ رہا تھا۔ آنکھیں باہر کو نکل آئی تھیں۔ وہ اپنے آپ کو چھڑانے کی جدوجہد کر رہے تھے، مگر سلطان کی گرفت

سخت تھی۔ اُس پر تو اِس وقت جنون سوار تھا اور وہ اپنی ساری طاقت اُن پر لگا رہا تھا۔

پھر آہستہ آہستہ صابر حسین کی مدافعت کم زور پڑنے لگی۔ اُن کا جسم اکڑنے لگا۔ اُن کی زبان حلق سے باہر نکل آئی اور پھر ایک دم وہ بے جان ہو گئے۔ مگر سلطان نے اِس کے باوجود گردن نہیں چھوڑی۔ وہ تو دباؤ بڑھاتا ہی جا رہا تھا۔ اُس کی انگلیاں گردن میں پیوست ہو گئی تھیں اور اُس کی رگیں پھول گئی تھیں۔

پھر اسے احساس ہوا کہ صابر حسین ختم ہو چکے ہیں۔ اُس نے آہستہ آہستہ دباؤ کم کیا۔ صابر حسین کے جسم میں کوئی حرکت نہیں ہوئی۔ وہ صابر حسین کے سینے سے نیچے اُتر آیا اور پھر زمین پر گِر کر ہانپنے لگا۔ اُس کا پورا بدن کانپ رہا تھا۔ اُس نے اپنے عزیز دوست کا خون کر دیا تھا۔ خزانے نے ایک قتل کروا دیا تھا اور سلطان کی آنکھوں پر پٹّی باندھ دی تھی۔ لالچ نے اُسے اندھا کر دیا تھا اور اب اِس سارے خزانے کا وہ اکیلا مالک تھا۔ اب اِس میں کسی کا حصّہ نہیں تھا۔ اُس کا

دوست صابر حسین جس نے اُسے خط لکھ کر بُلوایا تھا اور اپنے ساتھ خزانے کی مہم میں شریک کیا تھا اس وقت اُس کے برابر میں مُردہ پڑا تھا اور اُس کی جان لینے والا اور کوئی نہیں، اُس کا عزیز راز دار دوست تھا۔

صابر حسین کی بیوی بیوہ ہو گئی تھی اور بیٹے یتیم ہو چکے تھے۔ خزانے کے حصول میں وہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ سچ ہے نا لالچ بُری بلا ہے۔ امانت میں خیانت کرنے والے کا انجام برا ہوتا ہے۔ اُسے اِس کی سزا ضرور ملتی ہے۔

اِدھر صابر حسین نے امانت میں خیانت کی تھی اور اُسے اُس کی سزا مل گئی تھی۔ اُدھر سلطان نے ایک بڑا گناہ کیا تھا۔ اُس نے ایک انسان کی، اپنے دوست کی جان لی تھی۔ دولت کی خاطر اُس نے بد دیانتی کی تھی۔ لالچ نے اُسے قاتل بنا دیا تھا۔ اُسے اچانک خوف محسوس ہوا۔ اُسے یوں لگا کہ جیسے صابر حسین کی روح اُس کی طرف بڑھ رہی ہے۔ اُس نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔ صرف ہوا کی سرسراہٹ تھی اور درختوں کے سائے۔

اُس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ اُس نے سوچا کہ وہ یہاں سے فوراً بھاگ جائے۔ اسے ڈر لگنے لگا تھا۔ صابر حسین کی لاش اُسے خوف زدہ کر رہی تھی۔ اُس نے دونوں تھیلے اور کُچھ دوسرا ضروری سامان سمیٹا اور پھر سارا سامان کندھے پر لاد کر ایک دم بھاگ اٹھا۔ وہ جلد از جلد یہاں سے دور نکل جانا چاہتا تھا۔ وہ بھاگتا رہا۔ اندھیرے میں کئی مرتبہ وہ ٹھوکر کھا کر گرا مگر پھر اُٹھ کر بھاگنے لگتا۔

رات آہستہ آہستہ گزرتی جا رہی تھی اور صابر حسین کی لاش بے گور و کفن جنگل کے ایک دور دراز حصّے میں پڑی ہوئی تھی۔ پروفیسر طلعت مرزا اور اُس کے ساتھی جڑی بوٹیوں کی تلاش میں بھٹکتے ہوئے اُس طرف آ نکلے اور تب اُن کی نظر اُس لاش پر پڑی، سب چونک کر رُک گئے۔ اُنہوں نے اُس لاش کو پہچان لیا۔ طلعت مرزا بڑبڑائے۔ ”ارے یہ تو اُنہی دونوں میں سے ایک کی لاش ہے؟“

”ہاں جناب، میرا خیال ہے کہ یہ کسی حادثے کا شکار ہو گئے ہیں۔“ ایک ساتھی بولا۔

دوسرے نے کہا۔ ”نہیں جناب! لگتا ہے اِسے گلا گھونٹ کر مارا گیا ہے۔ دیکھئے اِس کی زبان بھی باہر نکلی ہوئی ہے اور گردن پر انگلیوں کے نشان بھی ہیں۔“

تیسرے نے کہا۔ ”یقیناً اِسے اِس کے دوسرے ساتھی نے مارا ہے، مُجھے تو وہ پہلے ہی خطرناک آدمی لگتا تھا۔“

طلعت مرزا اُس لاش کو دیکھ کر پریشان ہو گیا تھا۔ اُس نے صابر حسین کے سامان کی تلاشی لی۔ پھر اسے اُن کی جیب سے شناختی کارڈ مل گیا۔ ایک ڈائری بھی ملی جس میں اُسی نقشے اور خزانے کا ذکر تھا۔

طلعت مرزا نے وہ ڈائری دیکھ کر کہا۔ ”ہوں تو یہ بات تھی۔ یہ دونوں خزانے کی تلاش میں آئے تھے۔ اِسی لیے رات کو ہمیں دھوکا دے کر بھاگ گئے تھے۔“

ایک ساتھی نے کہا۔ ”اور لگتا ہے کہ اُنہیں وہ خزانہ مل گیا تھا اور اِس کے ساتھی نے لالچ میں آکر اپنے ساتھی کو ختم کر دیا۔“

”ہاں یہی بات ہو سکتی ہے۔“طلعت مرزا نے کہا۔

اس کے بعد وہ اِس واقعے پر کُچھ دیر گُفت گو کرتے رہے۔“ پھر اُنہوں نے کہا کہ دو آدمی یہاں موجود رہیں اور باقی لوگ پولیس کو جا کر اطلاع کر دیں تا کہ لاش کو اس کے عزیزوں کے گھر بھجوا دیا جائے۔

فوراًہی دو آدمی پولیس کو اطلاع دینے کے لیے روانہ ہو گئے۔

پولیس آئی اور لاش کو اُٹھا کر شہر لے آئی۔ طلعت مرزا نے پولیس کو تفصیل کے ساتھ تمام واقعات بتا دیے اور سلطان کا حُلیہ بھی بتایا۔ پولیس نے فوراً تمام علاقے کی ناکہ بندی کروادی اور ہر جگہ سلطان کی تلاش شروع ہو گئی۔

پھر ضروری کارروائی کرنے کے بعد اور لاش کا پوسٹ مارٹم کرنے کے بعد ایک تابوت میں لاش رکھ کر صابر حسین کے شہر روانہ کی گئی۔ جب لاش گھر پہنچی تو سب کو سکتہ ہو گیا۔ اسلم حیران حیران آنکھوں سے اپنے بابا کی لاش کو دیکھ رہا

تھا۔ اُس کے معصوم سے ذہن میں بہت بڑا سوالیہ نشان تھا۔ صابر حسین کی بیوی رضیہ بیگم لاش دیکھتے ہی بے ہوش ہو گئی۔ دونوں چھوٹے بچے اِس ماحول سے گھبرا کر رونے لگے اور اسلم حیران پریشان سوچ رہا تھا۔ "بابا تو اُس کے لیے کھلونے اور کتابیں لانے کا وعدہ کر کے گئے تھے۔ پھر یہ سب کیا ہے۔"

"جب اُسے معلوم ہوا کہ اُس کے بابا کو اُن کے دوست اور اُن کے چاچا سلطان نے مارا ہے تو وہ اور بھی حیران ہوا۔ پھر غصّے سے اُس کے ہاتھوں کی مُٹھّیاں بھنچ گئیں۔ اُس کی آنکھوں میں شدید نفرت تھی اور اُس کے ذہن میں سلطان چاچا کا چہرہ گھوم رہا تھا۔

صابر حسین کو دفنا دیا گیا۔ اسلم اور دونوں بچّے سلیم اور صفیہ بھی اپنے بابا کو یاد کر کے روتے رہتے۔ اُنہیں اِس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ اب اُن کے ابّو کبھی واپس نہیں آئیں گے۔ اُن کی امّی رضیہ بیگم ایک باہمّت خاتون تھیں۔ وہ اُنہیں سینے سے لگائے اُن کا دِل بہلاتی رہیں۔ اب وہی اپنے بچّوں کا ایک سہارا تھیں اور

انہی کو اپنے بچّوں کی دیکھ بھال اور پرورش کرنی تھی۔ کوئی قریبی رشتے دار تو تھا نہیں کہ جو اُنہیں اپنے پاس رکھ لیتا۔ اس لیے رضیہ بیگم نے اللہ کا نام لے کر اپنے چھوٹے سے خاندان کو پالنے کا بیڑا اُٹھایا۔ وہ کوئی پڑھی لکھی خاتون نہیں تھیں اور نہ ہی اُنہیں کوئی خاص ہُنر آتا تھا بس کُچھ سینا پرو نا اور کاڑھنا آتا تھا، سو اُنہوں نے محلے والوں کے اور جاننے والوں کے کپڑے سینے شروع کر دیے، سردیوں میں دو سوئیٹر، جرسیاں بُنتیں۔ رضائیوں، گدّوں میں ڈورے ڈالتیں اور گرمیوں میں کپڑے سیتیں۔

سلطان کا کُچھ پتا نہیں چلا تھا۔ اللہ جانے اُسے زمین کھا گئی تھی یا آسمان نگل گیا تھا۔ پولیس نے اُسے بہت تلاش کیا۔ کئی جگہ چھاپے مارے مگر اُس کا کہیں پتا نہیں چلا۔ وہ تو اِس طرح غائب ہوا تھا جیسے کبھی اُس کا وجود ہی نہیں تھا۔

اسلم اپنے ابّو کو اکثر یاد کرتا۔ دو سال گزرنے کے باوجود وہ اپنے ابّو کو نہیں بھول سکا تھا اور نہ ہی وہ سلطان کو بھلا سکا تھا۔ سلطان کا چہرہ اب بھی اُس کے ذہن میں

محفوظ تھا۔

اُن دِنوں اسلم آٹھویں جماعت میں تھا۔ سلیم چوتھی کلاس میں اور صفیہ دوسری جماعت میں پہنچ گئی تھی۔ اسلم کو پڑھنے کا بہت شوق تھا اور وہ خوب محنت اور لگن سے پڑھتا تھا۔ اسکول میں ٹیچر جو کام دیتے وہ دِل لگا کر کرتا۔ وہ کلاس میں اکثر اوّل نمبر آتا۔ اُسے اوّل آئے پر اسکول کی طرف سے کئی انعام بھی ملے تھے۔

اسلم کی خواہش تھی کہ وہ بڑا ہو کر ڈاکٹر بنے گا اور غریبوں اور بے سہاروں کی مدد کرے گا۔ کبھی کبھی وہ سوچتا کہ وہ پولیس انسپکٹر بنے گا اور مجرموں اور قاتلوں کو گرفتار کرے گا۔ اُنہیں سخت سزا دے گا۔

اَن دِنوں اسلم آٹھویں جماعت کے امتحانات کی تیّاری کر رہا تھا۔ اُس کی خواہش تھی کہ اِس مرتبہ بھی وہ سارے اسکول بلکہ سارے شہر میں اوّل آئے۔ چنانچہ اِسی لیے وہ سخت محنت کر رہا تھا۔ وہ اسکول سے آکر کھانا کھانے کے بعد پھر

پڑھنے بیٹھ جاتا اور رات دیر تک امتحان کی تیّاری میں مصروف رہتا۔ اُسے معلوم تھا کہ علم بڑی دولت ہے اور جس کے پاس علم نہیں، اعلیٰ تعلیم نہیں، وہ معاشرے میں کوئی مقام حاصل نہیں کر سکتا اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ علم اور اعلیٰ تعلیم محنت، کوشش اور جدوجہد کے بغیر حاصل نہیں ہوتی۔ وہ اپنی ماں کو محنت مزدوری کرتے دیکھتا تو سوچتا کہ کاش وہ جلدی سے بڑا ہو جائے تاکہ وہ اپنی ماں کر سُکھ دے سکے اور اپنی بہن اور بھائی کو پڑھا سکے۔ ایسے میں اسے ابّو بہت یاد آتے۔ وہ سوچتا، اگر آج ابّو زندہ ہوتے تو پھر ماں کو یہ کام نہیں کرنے پڑتے۔ وہ بھی آرام سے بے فکر ہو کر پڑھتا رہتا۔

اُس رات بھی اسلم اپنے کمرے میں بیٹھا پڑھ رہا تھا۔ اُس کی ماں اور دونوں بہن بھائی دوسرے کمرے میں سوئے ہوئے تھے۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی مگر وہ سر جھکائے پڑھنے میں لگا ہوا تھا۔ اچانک گلی میں بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز آئی۔ اِس کے ساتھ ہی کتّے بھونکنے لگے۔ اُن کی کرخت آوازوں سے پورا محلہ گونج اٹھا، پھر ایک فائر بھی ہوا۔ کتّے مسلسل بھونک رہے تھے۔ دفعتاً

اسلم کو یوں محسوس ہوا جیسے کوئی اُن کے مکان کی دیوار پھاند کر اندر داخل ہوا ہے۔ وہ بے چینی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُسے بہت ڈر محسوس ہونے لگا۔ وہ اپنی امّی کے پاس دوسرے کمرے میں جانے کے لیے جیسے ہی کمرے سے باہر نکلا۔ ایک دم چونک پڑا اور اُس کے قدم ایک جگہ پر جم کر رہ گئے۔ خوف سے وہ کانپنے لگا۔

سامنے ایک شخص کھڑا تھا۔ ایک ہاتھ سے اُس نے اپنا ایک بازو پکڑ رکھا تھا۔ شاید وہاں گولی لگی تھی، کیوں کہ اُس کے کپڑے خون میں تر تھے۔ اسلم نے چیخنے کی کوشش کی مگر اُس آدمی نے ایک دم آگے بڑھ کر اُس کا مُنہ بند کر دیا اور سرگوشی میں بولا: ”شور مت مچاؤ، میں کوئی چور ڈاکو نہیں ہوں ایک پولیس انسپکٹر ہوں۔ کُچھ اسمگلر میرے پیچھے ہیں۔ میں اُن سے بچ کر بھاگا ہوں۔ تُم جلدی سے مُجھے کوئی چھُپنے کی جگہ بتاؤ اور اگر تمہارے گھر میں کوئی ہتھیار ریوالور، پستول وغیرہ ہو تو مُجھے لا دو۔“

اسلم نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔ ”جناب! ہمارے پاس کوئی ہتھیار نہیں۔“

”اچھّا، اچھّا کوئی بات نہیں، تُم مُجھے چھُپنے کی جگہ بتاؤ۔“ زخمی شخص نے کہا۔ اسلم اُسے اپنے کمرے میں لے آیا۔ زخمی شخص نے ایک نظر کمرے پر ڈالی۔ اُسی وقت دروازے پر زور دار دستک ہوئی۔ اسلم گھبرا گیا۔ اُس کا دِل زور زور سے دھک دھک کرنے لگا۔ زخمی شخص نے سرگوشی کی۔ ”یہ وہی خطرناک اسمگلر ہوں گے۔“ یہ کہہ کر وہ سامنے بچھی چارپائی کے نیچے کھِسک گیا اور آہستہ سے بولا: ”لڑکے!! تُم گھبراؤ مت، بس تم خاموشی سے لیٹ جاؤ۔“

اسلم اُس پلنگ پر بیٹھ گیا۔ دروازے پر دوبارہ دستک ہوئی اور دستک کی آواز سُن کر اُس کی امّی بھی جاگ اُٹھیں۔ وہ جلدی سے دروازے کے پاس آئیں اور پوچھا!

”کون ہے؟“

باہر سے آواز آئی: ”ہم پولیس کے آدمی ہیں۔ دروازہ کھولیے۔“

”پولیس!“ رضیہ بیگم بڑبڑائی۔ پھر اُس نے دروازہ کھول دیا۔ سامنے تین چار آدمی کھڑے تھے مگر اُن کے جسموں پر سادہ لباس تھے، پولیس کی وردی نہیں

تھی۔ اُن میں سے ایک نے کہا:

"یہاں ایک خطرناک ڈاکو نظر آیا تھا۔ ہم اُس کے تعاقب میں ہیں۔ کہیں وہ آپ کے مکان میں تو نہیں گھُس آیا؟"

رضیہ بیگم نے کہا۔ "نہیں جی۔۔۔۔۔ یہاں تو کوئی نہیں آیا؟"

"اچھّا ٹھیک ہے۔ مگر آپ ہوشیار رہیے گا۔ وہ بہت خطرناک ڈاکو ہے۔ ہم نے اسے یہیں آس پاس کسی مکان میں کوُدتے ہوئے دیکھا تھا۔"

رضیہ بیگم خاموش رہیں۔ وہ سب انہیں بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔ پھر وہ آگے بڑھ گئے۔ رضیہ بیگم نے دروازہ بند کر دیا اور پھر وہ اسلم نے کمرے میں روشنی دیکھ کر اُس طرف بڑھیں۔ کمرے میں داخل ہوئیں تو اسلم پلنگ پر بیٹھا تھا۔ وہ بولی۔ "اسلم بیٹا! تُم ابھی تک سوئے نہیں۔ دیکھو تو سہی کتنی رات ہو گئی ہے۔"

اسلم نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ ”امّی باہر کون تھا؟“

امّی نے جواب دیا۔ ”پولیس والے تھے۔ کوئی ڈاکو یہاں نظر آیا تھا۔ وہ پوچھ رہے تھے کہ کہیں وہ ہمارے گھر میں تو نہیں گھُس آیا۔ کیوں کہ وہ اِسی طرف کہیں غائب ہو گیا ہے۔ میں نے کہا کہ نہیں یہاں تو کوئی نہیں آیا۔ وہ ہوشیار کر گئے ہیں۔“ پھر اچانک وہ اسلم کے چہرے کی طرف دیکھ کر بولیں۔ ”کیا بات ہے بیٹا۔ یہ تُم اتنے پریشان کیوں ہو؟ کیا ہوا تمہیں؟“

اسلم جلدی سے بولا۔ ”کُچھ نہیں امّی، میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔ کوئی بات نہیں ہے۔“

اُسی لمحے اکبر پلنگ کے نیچے سے نکل آیا۔ رضیہ بیگم اُسے دیکھ کر خوف سے گھبرا گئیں۔ اکبر نے اُن سے کہا کہ وہ خوف زدہ نہ ہوں۔ پھر اُس نے اپنے بارے میں بتایا کہ وہ کون ہے اور کیوں یہاں چھُپ گیا ہے۔

اس نے کہا۔ ”میرا نام اکبر علی خان ہے اور میں پولیس انسپکٹر ہوں۔ کافی دِنوں سے میں کُچھ اسمگلروں کے تعاقب میں تھا۔ آخر میں نے اُن کے خُفیہ اڈّے کا پتا چلالیا۔ میں جلد ہی اُن کے اڈّے پر چھاپہ مارنے والا تھا۔ میں ابھی چھاپہ مارنے کی تیّاری ہی کر رہا تھا کہ اِن لوگوں نے مُجھے اغوا کر لیا۔ اور ایک مکان میں قید کر دیا۔ وہ مُجھ سے معلوم کرنا چاہتے تھے کہ مُجھے اُن کے کتنے اڈّوں کا پتا معلوم ہے۔ آخر آج رات میں موقع پا کر اُس مکان سے بھاگنے میں کامیاب ہو گیا۔ مگر اُنہیں میرے فرار کا علم ہو گیا اور وہ میرے پیچھے بھاگے۔ میں چھُپتا چھُپاتا اس گلی میں آ نکلا مگر وہ بھی یہاں پہنچ گئے اور اُنہوں نے مُجھے مارنے کے لیے فائر کیا۔ گولی میرے بازو پر لگی۔ پھر میں تمہارے گھر میں کود گیا۔ وہ اب بھی میری تلاش میں ہوں گے۔ مگر میں اب انہیں جلد ہی گرفتار کر لوں گا۔ اِس وقت اگر میرے پاس کوئی ریوالور وغیرہ ہوتا تو پھر میں ابھی اُنہیں گرفتار کرنے کی کوشش کرتا۔ مگر خیر اب بھی وہ کہاں بھاگ کر جائیں گے۔“

رضیہ بیگم کو یہ سُن کر اطمینان ہوا۔ پھر اُن کی نظر اکبر کے زخمی بازو پر گئی تو وہ

جلدی سے بولیں۔ ”ارے، آپ تو زخمی ہیں۔ لائیے، میں آپ کے پٹّی باندھ دوں۔“ اسلم دوڑ کر دواؤں کا ڈبّا لے آیا۔ رضیہ نے زخم صاف کر کے اُس پر بہت سی روئی رکھی اور پٹّی باندھ دی۔ زخم گہرا نہیں تھا۔ گولی بازو سے گزرتی ہوئی نکل گئی تھی۔ پھر اُنہوں نے جلدی جلدی دودھ گرم کیا اور اکبر کو دیا۔ اکبر بھوکا بھی تھا اور خُون بہنے سے کم زوری بھی محسوس کر رہا تھا۔ گرم گرم دُودھ نے جیسے اُس میں نئی جان ڈال دی۔

رضیہ بیگم اور اسلم نے اصرار کر کے اکبر کو بستر پر لِٹا دیا اور اُس سے کہا کہ وہ اب آرام کرے۔ اکبر بستر پر لیٹ گیا۔ رضیہ بیگم اور اسلم کمرے سے جانے لگے تو اکبر نے اسلم کو روک لیا اور اُس سے باتیں کرنے لگا۔ اُس نے اسلم سے کہا۔

”تم بہت اچھّے لڑکے ہو۔ تمہاری ماں بہت نیک عورت ہیں۔ تم کس جماعت میں پڑھتے ہو؟ تمہارے ابّا کہاں ہیں؟“

اسلم نے جواب دیا۔ ”میں آٹھویں جماعت میں پڑھ رہا ہوں، میرے ابّا اب اِس

دُنیا میں نہیں۔ میرے دو چھوٹے بہن بھائی ہیں اور یہ میری امّی۔"

پھر اسلم نے اپنے باپ کے بارے میں پورا قصّہ اکبر کو سُنا دیا اور بتایا کہ کس طرح اُس کے باپ کے دوست سلطان نے اُن کی جان لی۔ اکبر اسلم اور اُس کی ماں کا پہلے ہی احسان مند تھا۔ اب اُسے اِن لوگوں سے ہمدردی بھی پیدا ہو گئی۔ وہ کہنے لگا! "تم فکر مت کرو، میں اُس شخص کو جس نے تمہارے باپ کو مارا ہے، تلاش کروں گا اور اُسے بہت جلد اپنے کیے کی سزا ملے گی۔"

اسلم کو یوں محسوس ہوا کہ جیسے اب اُس کی برسوں کی تمنّا پوری ہونے کا وقت آ گیا ہے۔ جیسے اُسے کوئی مضبوط سہارا مل گیا ہے۔ اُس نے سوچا کہ اکبر ضرور سلطان کو تلاش کر سکتا ہے۔ کیوں کہ وہ ایک پولیس افسر ہے اور سب مجرموں کے بارے میں ضرور جانتا ہو گا۔

پھر اکبر نے کہا کہ اب وہ سو جائے۔ اسلم نے گھڑی دیکھی۔ تین بج رہے تھے۔ وہ فرش پر دری بچھا کر لیٹ گیا اور پھر جلد ہی اُس کی آنکھ لگ گئی۔ صُبح وہ دیر تک

سوتا رہا۔ رضیہ بیگم جب صُبح اٹھیں تو اُنھوں نے اسلم کے کمرے میں جھانکا۔ اکبر جا چکا تھا۔ وہ اُجالا ہونے سے پہلے ہی چُپکے سے نکل گیا تھا۔

ناشتے پر رضیہ بیگم اور اسلم دیر تک اکبر علی کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔

اسلم کے امتحانات سر پر تھے اور وہ ہمیشہ کی طرح اچھّے نمبر حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اِس لیے دِل لگا کر تیّاری کر رہا تھا۔ اِس دوران اُسے اکبر کی یاد آتی رہی مگر وہ اُس کے بارے میں زیادہ سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ اِس طرح اُس کا ذہن بٹ جاتا اور وہ صحیح طرح امتحانات کی تیّاری نہیں کر سکتا تھا۔

آخر کار امتحانات شروع ہوئے اور اُس کے تمام پرچے اُس کی اُمّید کے مطابق اچھّے اور شان دار ہوئے اور جب امتحانات کا نتیجہ آیا تو وہ ہمیشہ کی طرح جماعت میں اوّل آیا تھا۔

امتحانات سے فارغ ہوا تو اُسے اکبر کے بارے میں سوچنے کا وقت ملا اور وہ سوچنے

لگا کہ شاید اکبر وعدے کے مطابق اُس سے ملنے آ جائے یا شاید وہ سلطان کے بارے میں کوئی خبر لائے مگر اسے اکبر کے متعلّق کوئی خبر نہیں ملی۔

اُس کی امّی رضیہ بیگم ابھی تک اڑوس پڑوس کے کپڑے لتّے سی پرو کر گزر اوقات کر رہی تھیں۔ کوئی اور سہارا تو تھا نہیں، لیکن اِس کے باوجود اُن کی خواہش یہی تھی کہ اُن کے بچّے اچھّی اور اعلیٰ تعلیم حاصل کریں، لیکن اچانک اسلم نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔

وہ چھوٹا تھا مگر اُسے اِس بات کا بڑی شدّت سے احساس تھا کہ اُس کی ماں کو بہت محنت کرنی پڑ رہی ہے۔ اُن کی خاطر وہ رات دِن محنت کرتی رہتی ہیں۔ نہ دِن کا آرام اُنہیں نصیب ہے اور نہ رات کا چین۔ وقت سے پہلے اُن پر بڑھاپا آ گیا ہے۔

اسلم نے عہد کیا کہ اب وہ اپنی امّی کو کوئی کام نہیں کرنے دے گا۔ اب وہ خود کام کرے گا اور گھر کی ذمّے داری سنبھالے گا۔ اب یہ اُس کا فرض ہے کہ وہ اپنی امّی کی خدمت کرے۔ اب اُس کے اندر کام کرنے کی صلاحیت ہے اگر اُسے کسی

ادارے میں ملازمت نہیں مل سکتی تو وہ کہیں مزدوری کر لے گا۔

جب اُس نے اپنی امّی سے اِس بات کا ذکر کیا تو اُنہوں نے کہا کہ وہ ابھی آگے پڑھے، ابھی ملازمت کے بارے میں نہیں سوچے۔ مگر اُس نے تو پکّا اِرادہ کر لیا تھا کہ اب وہ کسی بھی صورت میں ماں کو محنت مزدوری نہیں کرنے دے گا، چناں چہ رضیہ بیگم نے اُس کی ضد دیکھ کر خاموشی اختیار کر لی۔

اسلم نے دوسرے ہی دِن سے کام کی تلاش شروع کر دی اور آخر ایک ورک شاپ میں ملازمت اختیار کر لی جہاں موٹر گاڑیوں کی صفائی، دیکھ بھال اور چھوٹی موٹی مرمّت کا کام اُس کے ذمّے تھا۔ پھر جلد ہی وہ اچھّا خاصا کام سیکھ گیا اور اب اُس کی تنخواہ پانچ سو روپے ماہانہ تھی۔ اِس کے علاوہ پرائیویٹ طور پر بھی وہ گھروں میں جا کر گاڑیوں وغیرہ کی سروس کرنے لگا۔

ایک سال کی مدّت میں وہ اچھّا خاصا کام سیکھ چکا تھا۔ سلیم اُن دِنوں چھٹّی جماعت میں پڑھ رہا تھا اور صفیہ چوتھی کلاس میں زیرِ تعلیم تھی۔ اسلم کی خواہش تھی کہ

اُس کے دونوں بہن بھائی اعلیٰ تعلیم حاصل کریں۔ وہ دونوں بھی بھائی کی خواہش کالحاظ رکھتے ہوئے خوب دِل چسپی سے پڑھتے تھے۔ ایک روز سلیم حسبِ معمول اسکول گیا لیکن پھر شام ہو گئی اور وہ لوٹ کر نہیں آیا۔ رضیہ بیگم سخت پریشان تھی۔ اسکول کی چھٹّی ایک بجے ہی ہو جاتی تھی اور اب چھے بج رہے تھے۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ سب دوستوں سے معلوم کیا مگر سب نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ اسلم کو اُس کے ورکشاپ سے بُلوایا گیا اور وہ بھی سلیم کے غائب ہو جانے کی خبر سُن کر سخت پریشان ہو گیا۔ وہ ہر طرف اُسے ڈھونڈنے لگا۔ جہاں ذرا سی بھی اُمّید نظر آئی، وہاں بھا گا بھا گا گیا مگر ہر طرف سے ناکامی ہوئی۔

دوسرے دِن پولیس اسٹیشن میں سلیم کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرا دی گئی۔ اُس کے باوجود سلیم کا کُچھ پتا نہیں چل سکا۔ پولیس نے اُسے کافی تلاش کیا لیکن وہ بھی ناکام رہی اور سلیم کو بر آمد نہیں کر سکی۔ سب کا یہی خیال تھا کہ سلیم کو اغوا کر لیا گیا ہے۔ اب اغوا کرنے والے کون تھے، اِس کے بارے میں سب مختلف رائے دے رہے تھے۔

رضیہ بیگم سلیم کی جُدائی میں بیمار پڑ گئیں۔ اسلم مسلسل بھاگ دوڑ کر رہا تھا۔ وہ اپنے بھائی کی تلاش میں مارامارا پھر رہا تھا۔ ایک دِن وہ ایک سڑک پر جارہا تھا کہ اچانک ایک جیپ اس کے قریب آکر رکی۔ سڑک سُنسان پڑی تھی اور دور دور تک کوئی ٹریفک تھی اور نہ کوئی آدمی نظر آرہا تھا۔

جیپ کے رُکتے ہی اسلم ٹھٹھک کر رُک گیا۔ جیپ میں سے دو آدمی اُترے تھے اور ایک دم اُسے اپنے گھیرے میں لے لیا۔ اسلم ابھی کُچھ سمجھ بھی نہیں پایا تھا کہ ایک نے رومال نکالا اور اُس کی ناک پر لگا دیا۔ دوسرے نے اسے اپنے دونوں ہاتھوں سے دبوچ لیا۔ اسلم نے سنبھلنے کی کوشش کی مگر ایک ایسے زور کا چکّر آیا اور دوسرے ہی لمحے وہ بے ہوش ہو گیا۔ یقیناً اُس رومال میں کلوروفام تھا۔

دونوں آدمیوں نے بے ہوش اسلم کو جیپ میں ڈالا اور پھر جیپ تیز رفتاری سے سڑک پر دوڑنے لگی۔

اسلم کو ہوش آیا تو اُس نے اپنے آپ کو پتھّر کی زمین پر لیٹے ہوئے پایا۔ ایک لمحے

کو تو اُس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کہاں ہے، پھر آہستہ آہستہ اُسے سارا واقعہ یاد آ گیا اور وہ ایک دم چونک کر اُٹھ بیٹھا۔ اُس نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا تو اُسے وہاں اور بھی بہت سے لڑکے نظر آئے۔ اُس کا دِل دھڑکنے لگا۔ اُسے محسوس ہو گیا کہ اُسے اغوا کر لیا گیا ہے۔

شام گہری ہو گئی تھی اِس لیے وہ صحیح طور پر اِن لڑکوں کی شکلیں نہیں دیکھ سکا مگر یہ وہ جان گیا تھا کہ اِن سب لڑکوں کو بھی اغوا کیا گیا ہے۔ مگر اُنہیں کِن لوگوں نے اغوا کیا ہے؟ فوری طور پر وہ نہیں سوچ سکا۔ لیکن پھر اچانک اسے بیگار کیمپ کا خیال آیا اور ایک دم کانپ اٹھا۔ اُس نے بیگار کیمپوں کے متعلّق بہت ساری کہانیاں اور واقعات بڑھ اور سُن رکھے تھے۔

"یہ تو بیگار کیمپ ہے۔" اسلم نے سوچا۔ اُس نے ایک بار پھر چاروں طرف کا جائزہ لیا۔ اُن کے چاروں طرف خار دار تاروں کا حصار قائم تھا اور کئی خوف ناک آدمی وہاں پہرا دے رہے تھے جِن کے ہاتھوں میں بندوقیں تھیں۔ ایک کونے

میں ایک خوف ناک چہرے والے شخص نے ایک مشعل جلا دی جس سے تھوڑی سی روشنی پھیل گئی۔

اسلم خوف زدہ تھا۔ اب اُسے بھوک بھی لگنے لگی تھی مگر وہ کھانا کہاں سے کھاتا۔ پتا نہیں یہ لوگ کب کھانا دیں گے۔ وہ سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ اُسے اپنی امّی اور بہن یاد آنے لگی۔ پھر اُسے سلیم کا خیال آیا۔ اللہ جانے اُس کا کیا حال ہو گا۔ وہ کہاں ہو گا۔ ہو سکتا ہے اُسے بھی ایسے ہی کسی کیمپ میں رکھا گیا ہو۔

اِن سب کو یاد کر کے اُس کا دِل بھر آیا اور اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اُس نے سوچا کہ کیا اب یہاں سے اسے آزادی مل بھی سکے گی یا نہیں، کیوں کہ اُس نے اِس قسم کے بہت سے واقعات سُن رکھے تھے اور پڑھ رکھے تھے کہ جس میں خر کار لوگ بھاگنے کی کوشش کرنے والے بچّوں کو گولی مار دیتے تھے یا اُنہیں معذور کر کے اُن سے بھیک منگواتے تھے۔ وہ اِس تصوّر سے ہی ایک لمحے کو کانپ اٹھا اور خاموشی سے دِل ہی دِل میں اللہ سے مدد کی دُعا مانگنے لگا۔

اُسے یقین تھا کہ اللہ مُصیبت کے وقت اپنے بندوں کی دُعا ضرور سُنتا ہے اور اُن کی مدد کرتا ہے۔

بھوک اب نا قابلِ برداشت ہو گئی تھی اور اُس کے پیٹ میں اینٹھن ہونے لگی تھی۔ وہ پیٹ دبائے آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا کہ دفعتاً ایک شور سا بُلند ہوا۔ اُس نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو اُسے دو تین آدمی نظر آئے جو کھانا تقسیم کر رہے تھے۔ لڑکوں نے ایک قطار بنائی تھی۔ وہ بھی اُٹھ کر اُس قطار میں شامل ہو گیا۔ کُچھ دیر بعد ہی اس کے ہاتھ میں بھی ایک بڑی سی تنوری روٹی اور پانی جیسی دال سے بھری ایک کٹوری تھی۔ وہ جلدی جلدی روٹی حلق سے نیچے اُتارنے لگا۔ کھانا کھا کر اُس نے اللہ کا شکر ادا کیا اور پھر پانی پینے کے لیے اُس طرف بڑھ گیا جہاں پانی سے بھرے ہوئے مٹکے رکھے تھے۔ اُس نے کھانے کے دوران لڑکوں کو وہاں سے پانی پیتے دیکھ لیا تھا۔

وہ مٹکوں کے قریب پہنچا اور ایک ڈونگا بھر کر جیسے ہی پانی پینے لگا اُس کی نظر سلیم

پر پڑی۔ وہ ایک کونے میں سہما سمٹا بیٹھا روٹی کھا رہا تھا۔ اسلم ایک دم بھاگتا ہوا اُس کے قریب پہنچا اور بے اختیار اُس سے لپٹ گیا۔

سلم پہلے تو گھبرا گیا پھر جب اُس نے اپنے بھائی کو پہنچانا تو وہ بھی بھائی جان کہہ کر اُس سے لپٹ گیا۔ وہ سہمی ہوئی آواز میں بولا۔ ”بھائی جان! آپ، آپ بھی یہاں آ گئے۔ آپ کو پکڑ لیا اِن لوگوں نے۔۔۔۔۔“

اسلم نے کہا۔ ”ہاں، مگر تم فکر نہیں کرو۔ ہم یہاں سے نکلنے کی کوشش کریں گے۔“

پھر وہ دونوں ایک دوسرے کو اپنی اپنی کہانی سنانے لگے۔ سلیم نے بتایا کہ جب وہ اسکول سے چھٹّی کے بعد گھر آ رہا تھا تو دو آدمی اُس کے پاس آئے اور کہا کہ جلدی چلو تمہیں گھر پر بُلایا ہے۔ تمہاری امّی کی طبیعت صحیح نہیں ہے، ہمارے پاس جیپ ہے۔ تُم اِس میں بیٹھ جاؤ۔ میں گھبرا گیا اور بغیر کُچھ سوچے سمجھے اُن کے ساتھ جیپ میں بیٹھ گیا۔ اُنھوں نے جیپ میں بیٹھتے ہی میرے مُنہ پر رومال رکھ

دیا اور میں بے ہوش ہو گیا۔ جب آنکھ کھُلی تو خود کو یہاں موجود پایا۔

وہ دونوں کافی رات گئے تک وہاں بیٹھے گُفت گو کرتے رہے اور وہاں سے فرار ہونے کی ترکیبیں سوچتے رہے مگر کوئی ترکیب اُن کے ذہن میں نہیں آئی۔ وہاں سخت پہرا تھا اور اتنے سخت پہرے کو توڑنا اُن کے بس میں نہیں تھا۔ صُبح انہیں جلد اٹھا دیا گیا اور برائے نام ناشتا دینے کے بعد اُنہیں اُس جگہ پہنچا دیا گیا جہاں پتھّر توڑے جا رہے تھے۔ وہاں چھوٹی بڑی سب عُمروں کے بچّے تھے۔ زندگی میں پہلی مرتبہ اسلم نے کوئی بیگار کیمپ دیکھا تھا اور وہ کانپ اُٹھا تھا۔

وہ سارا دِن پتھّر توڑتے رہے۔ جب بھی کوئی لڑکا تھک کر سستانے لگتا تو اُن کے سروں پر کھڑے پہرے دار کوڑے مار مار کر اُنہیں پھر چوکس کر دیتے۔ اسلم یہ سب کُچھ دیکھ رہا تھا اور دِل ہی دِل میں پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ مگر وہ خود مجبور تھا اور خاموشی سے اپنا کام کیے جا رہا تھا۔ جب شام ہوئی تو اُنہیں دوبارہ اسی جگہ پہنچا دیا گیا۔ کُچھ دیر بعد اُن میں دہی دال روٹی تقسیم کی گئی۔

اِس طرح کئی دِن گُزر گئے۔ اسلم دوسرے لڑکوں کے ساتھ روزانہ پتھّر توڑتا اور پھر شام ڈھلے کیمپ میں آ کر سو جاتا۔ اس کا جسم اتنا تھک جاتا تھا کہ اسے اِس کے بعد کُچھ اور سوجھتی ہی نہیں تھی۔ زمین پر گِرتے ہی آنکھیں خود بخود بند ہونے لگتیں۔ اِس دوران کام کرتے ہوئے اُس نے وہاں سے فرار ہونے کی بہت سی ترکیبیں سوچیں مگر کوئی بھی ترکیب مکمّل نہیں تھی۔ ہر راستہ مسدود تھا اور بڑی سخت نگرانی ہوتی تھی۔

اسے اپنے چھوٹے بھائی سلیم اور دوسرے کم عمر لڑکوں کی حالت دیکھ کر بہت رونا آتا۔ مگر وہ کیا کر سکتا تھا۔ اُسے گھر کی بھی بہت یاد آتی۔ وہ دونوں بھائی مل کر دیر تک اپنے گھر کی، امّی اور صفیہ کی باتیں کرتے۔ اُنہیں اپنی امّی کے پریشان ہونے کا بھی خیال تھا۔ اُن پر کیا گزر رہی ہو گی۔ کیسی حالت ہو گی اُن کی۔ اسلم تو اِس کا اندازہ کر سکتا تھا کیوں کہ جب سلیم کھویا تھا تو جو اُن کی حالت ہوئی تھی، وہ اسلم نے دیکھی تھی۔ اُس وقت تو پھر بھی اسلم نے سنبھال لیا تھا۔ ڈھارس دی تھی۔ آس بندھائی تھی مگر اب تو وہ خود بھی اُن سے دور یہاں قید تھا۔ اُن کی جو حالت

ہو وہ کم ہے۔ وہ اللہ سے دُعا مانگتا رہتا تھا۔ اُسے اُمّید تھی کہ اللہ کوئی نہ کوئی راستہ ضرور لگائے گا۔ کسی نہ کسی طرح اُن کی مدد ضرور کرے گا۔

ایک شام وہ ابھی کھانا کھا کر لیٹے ہی تھے کہ بارش ہونے لگی۔ وہ کھلے آسمان کے نیچے تھے، کُچھ دیر وہ بھیگتے رہے مگر بارش میں آہستہ آہستہ شدّت اور تیزی آتی گئی۔ ٹپ ٹپ کرتی بوندیں ایک دم موسلا دھار بارش میں بدل گئیں۔ اِس کے ساتھ اتنی تیز ہواؤں کے ساتھ آندھی اور طوفان آگیا۔ آسمانی بجلی کی چمک اور گرج سے دِل دہلنے لگے۔ لگ رہا تھا کہ جیسے ابھی یہ بجلی اُن پر گِرے گی اور سب کو جلا کر راکھ کر دے گی۔

لڑکے خوف سے چیخنے چلّانے لگے۔ سارے کیمپ میں افراتفری پھیل گئی، پہرے دار خود پریشان ہو گئے تھے۔ ہر طرف گھرا اندھیرا پھیل گیا تھا۔ بس پہرے داروں کے پاس جو ٹارچیں تھیں اُن ہی کی روشنیاں اِدھر سے اُدھر چکراتی پھر رہی تھیں۔

پھر اُن سب بچّوں کو وہاں سے کسی محفوظ مقام کی طرف منتقل کیا جانے لگا۔ بچّے شور مچا رہے تھے۔ کسی پہرے دار نے کرخت آواز میں اُنہیں خاموش رہنے کا حکم دیا۔ لڑکے خاموش ہو گئے۔ پھر اُنہیں ایک قطار میں کھڑا کیا گیا اور اِس کے بعد وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھے۔ سب سے آگے دو پہرے دار تھے جن کے ہاتھوں میں ٹارچیں تھیں۔ درمیان میں بھی دو پہرے دار تھے اور سب سے آخر میں تین چار پہرے دار چل رہے تھے۔ اُن سب کے ہاتھوں میں ٹارچ کے ساتھ ساتھ بندوقیں بھی تھیں اور اُنہوں نے تمام لڑکوں کو دھمکی دی تھی کہ اگر کسی نے کوئی چالاکی دِکھانے کی کوشش کی تو وہ بے دریغ اُسے گولی مار دیں گئے۔

اسلم درمیان میں تھا اور اِس وقت وہ بہت چوکنّا تھا۔ اُسے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے آج قدرت نے اُس کے لیے ہی یہ موقع فراہم کیا ہے۔ وہ بڑی شدّت کے ساتھ اس موقع سے فائدہ اٹھانے کی سوچ رہا تھا۔ پہرے دار اس سے چند قدم آگے چل رہے تھے۔ وہ اب کسی خاص لمحے کا منتظر تھا۔ اس وقت بھی بارش ہو رہی

تھی اور بجلی وقفے وقفے سے چمک رہی تھی۔ بادل گرج رہے تھے اور ان کی کڑک اور چمک سے دِل دہل رہے تھے۔ سب بُری طرح بھیگ چکے تھے۔ پاؤں مٹّی سے لتھڑ گئے تھے اور وہ چلے جا رہے تھے۔

اس وقت وہ ایک چٹّان پر سے گزر رہے تھے۔ دونوں طرف گہری کھائیاں تھیں اور آگے میدان تھا۔ اسلم نے سوچا کہ بس اب یہی موقع ہے۔ ایک لمحے کو بجلی چمکی اور اس نے اس بجلی کی چمک میں سارا جائزہ لے لیا۔ دو پہرے دار اس سے دس قدم کے فاصلے پر تھے۔ دو سب سے آگے تھے اور تین چار پیچھے۔ وہ ایک دم قطار سے تھوڑا سا باہر نکل آیا۔ بجلی دوبارہ چمکی اور پھر اس کی چمک نے جیسے ہی دم توڑا اسلم نہایت پھُرتی کے ساتھ نیچے بیٹھا اور پھر نیچے ِگر کر نشیب میں لڑھکتا چلا گیا۔ اسے یقین تھا کہ اسے کسی نے نہیں دیکھا۔ وہ چٹان کے آخری کونے تک لڑھکتا چلا گیا۔ پھر ایک دم کھڑا ہوا اور تیز رفتاری کے ساتھ ان کی مخالف سمت میں دوڑنے لگا۔ وہ جلد سے جلد ان کی پہنچ سے دور نکل جانا چاہتا تھا۔ اِس لیے وہ بہت تیز بھاگ رہا تھا کئی بار وہ اندھیرے میں ٹھوکر کھا کر ِگرا مگر فوراً ہی سنبھل

گیا۔ اُسے یقین تھا کہ جلد ہی اُس کی تلاش شروع ہو جائے گی اس لیے وہ بارش اور اندھیرے کی پروا کیے بغیر بھاگے جا رہا تھا۔ اُس کے ذہن میں یہ خطرہ تو تھا کہ کہیں وہ اندھیرے میں کسی گہری کھائی میں نہ گر جائے لیکن یہ خطرہ تو اسے مول لینا ہی تھا۔

بارش مسلسل ہو رہی تھی، وہ سر سے پیر تک بھیگا ہوا تھا۔ پاؤں مٹّی میں لتھڑ گئے تھے لیکن اسے اس کی پروا نہیں تھی۔ یہی آندھی اور بارش تو اس کی مدد گار ثابت ہوئی تھیں۔ اگر آج آندھی اور بارش نہ آتی تو وہ بھلا کس طرح ان خطرناک خرکاروں کے چُنگل سے بچ کر جا سکتا تھا۔

اب ایک میدانی سِلسِلہ شروع ہو گیا تھا۔ اس نے وہ میدان عبور کیا تو ایک جنگل نظر آیا۔ وہ اس میں گھُستا چلا گیا۔ اس کے پیروں میں اب بھاگنے کی بالکل بھی سکت نہیں تھی لیکن اسے اس بات کا احساس تھا کہ اگر وہ ذرا بھی رُکا تو پھر دوبارہ پکڑا جا سکتا ہے۔

جنگل میں داخل ہونے کے بعد بارش کی شدّت سے اُسے نجات مل گئی۔ یوں بھی اب بارش کا زور ٹوٹنے لگا تھا۔ اندھیرا بہت زیادہ تھا اور چند فیٹ دُور کی چیز بھی نظر نہیں آرہی تھی، اس کا دِل بہت تیری سے دھڑک رہا تھا اور جنگل کی اس ہیبت ناک تاریکی اور خاموشی سے اُسے خوف محسوس ہونے لگا تھا۔ مختلف جانوروں کی آوازوں سے اُس کے اوسان خطا ہو رہے تھے۔ اس نے کہانیوں میں پڑھا تھا کہ گھنے اور تاریک جنگلوں میں روحیں اور جنّات بھٹکتے پھرتے ہیں۔ وہ کم زور دِل کا لڑکا نہیں تھا مگر جنگل کے اس بھیانک ماحول میں اسے بہت ڈر لگ رہا تھا۔ اُونچے اُونچے درختوں کے سائے اسے یوں لگ رہے تھے کہ جیسے بڑے بڑے دیو اپنے بازو پھیلائے کھڑے ہوں اور کسی بھی لمحے اُسے دبوچ لیں گے۔

پتّوں کی سرسراہٹ اور ہوا کی سائیں سائیں سے اُسے یوں لگ رہا تھا جیسے بہت سی بلائیں چیخ رہی ہوں۔ وہ ڈرا سہما تیز تیز قدموں سے آگے ہی آگے بڑھتا رہا۔ جنگل کہیں گھنا ہو جاتا اور کہیں چھدرا۔ وہ ساری رات چلتا رہا پھر صُبح کے آثار پیدا ہونے لگے۔ بارش تھم چکی تھی اور فضا جیسے دُھل کر نکھر گئی تھی۔ چڑیاں اور

پرندے شاخوں پر بیٹھے اللہ کی حمد کرنے لگے۔ دور مشرق کے دریچے سے سورج
کی کرنیں اپنا سر باہر نکالنے لگیں۔

وہ اب ایک میدان میں کھڑا تھا اور میدان کے ایک کونے میں مزار سا نظر آ رہا
تھا۔ اسلم تھکن سے نڈھال تھا۔ وہ مزار کی طرف بڑھ گیا۔ جب وہ اندر داخل
ہوا تو سامنے ہی برآمدے میں ایک ادھیڑ عمر پتلا دُبلا آدمی بیٹھا ہوا پیسے گِن رہا
تھا۔

اسلم اس شخص کو دیکھ کر ٹھٹک کر رُک گیا، اس شخص کے جسم پر فقیروں والا
لباس تھا۔ بال اور داڑھی بڑھی ہوئی تھی اور چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں عجیب سی
چمک تھی۔ یوں لگ رہا تھا کہ جیسے وہ اس مزار کا مجاور ہے۔ وہ اسلم کو دیکھ کر کھڑا
ہو گیا اور بولا: ”کون ہو تم؟“

اسلم نے جلدی جلدی اسے اپنی کہانی سُنائی کہ کس طرح وہ خرکاروں کے چنگل
سے نکل کر بھاگا ہے اور اب بھی وہ لوگ اس کے تعاقب ہیں۔ اسلم نے اس

شخص سے مدد کی درخواست کرتے ہوئے کہا کہ تم مُجھے کسی قریبی شہر میں پہنچا دوں تاکہ وہاں سے میں پولیس کی مدد حاصل کر سکوں۔ اس شخص نے کہا۔ ”تم جلدی سے اندر کمرے میں چھُپ جاؤ۔ وہ میرا حجرہ ہے۔ میں تمہیں شہر پہنچانے کی کوشش کروں گا۔ مگر ابھی نہیں۔ شاید ابھی وہ لوگ راستے میں کہیں مل جائیں۔ اتنے میں تم اندر آرام کرلو۔“

اسلم نے اُس کا شکریہ ادا کیا اور اندر حجرے میں داخل ہو گیا۔ وہ ایک چھوٹا سا کمرا تھا۔ پیچھے کی طرف ایک کھڑکی تھی۔ ایک طرف ایک چھوٹی سی لکڑی کی الماری رکھی تھی اور ایک طرف کونے میں ایک چارپائی بھی ہوئی تھی۔ اُس نے اندر داخل ہو کر حجرے کا دروازہ بند کر لیا اور پھر جا کر چارپائی پر لیٹ گیا۔ اتنے میں وہ مجاور اندر داخل ہوا اور ایک سوکھی روٹی اور آلو پالک کی سبزی کا سالن اُسے دیتے ہوئے کہا۔ ”لو تم یہ ناشتا کرلو تمہیں بھُوک لگ رہی ہو گی۔“

اسلم کو واقعی بھوک لگ رہی تھی۔ اُس نے جلدی سے وہ روٹی اور سالن لیا اور

کھانے لگا۔ آدمی دروازہ بند کر کے دوبارہ باہر نکل گیا۔ اسلم نے کھانا ختم کیا۔ ایک کونے میں رکھے مٹکے میں سے پانی پیا اور پھر اللہ کا شکر ادا کر کے دوبارہ چارپائی پر لیٹ گیا۔ اُس کی آنکھوں میں نیند بھری ہوئی تھی مگر وہ سونا نہیں چاہتا تھا۔ پتا نہیں کس وقت کیا واقعہ پیش آجائے۔

ابھی اُسے لیٹے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ اچانک کسی گاڑی کے انجن کی آواز آئی۔ آواز آہستہ آہستہ قریب آتی جا رہی تھی۔ وہ گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ اُسے یقین تھا کہ یہ انہی لوگوں کی گاڑی ہو گی اور وہ اس کی تلاش میں بھٹک رہے ہیں۔

پھر گاڑی مزار کے قریب آ کر رُک گئی۔ اسلم چوکنّا تھا۔ اس کے کان کھڑے ہو گئے تھے۔ اس نے حجرے کے دروازے میں سے جھانک کر دیکھا۔ اسے دو آدمی نظر آئے اور اُنہیں اس نے پہچان لیا۔ وہ خر کاروں کے ہی ساتھی تھے۔ وہ اس مجاور سے اُسی کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ اُن کی آوازیں اسلم کو صاف سُنائی دے رہی تھیں۔ وہ دونوں کہہ رہے تھے۔ ”شاہ جی! ہم پہلے بھی تیری خدمت

کرتے رہے ہیں۔ جلدی بول کہاں ہے وہ؟“

”ہاں، ہاں شاہ جی تو فکر نہ کر تُجھے ہم اچھّی خاصی رقم دیں گے۔“

شاہ جی نے کہا۔ ”ٹھیک ہے۔ تو پھر آؤ میرے ساتھ۔“

اسلم نے یہ سب کُچھ سُنا تو اُس کے ہوش اُڑ گئے۔ یہ تو بڑی خطرناک صورتِ حال تھی۔ وہ شخص اِس کا سودا کر رہا تھا۔ اُس نے گھبرا کر فرار کا راستہ تلاش کرنے کے لیے کمرے میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں، پھر وہ بھاگ کر کھڑکی کے پاس پہنچا۔ اس نے کھڑکی کے پٹ کھونے اور اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ کھڑکی میں سلاخیں نہیں تھیں۔ اُس نے ایک چھلانگ میں کھڑکی پار کرلی۔

جب شاہ جی کمرے میں داخل ہوا تو کمرا خالی تھا اور اسلم کا وہاں کوئی نام و نشان نہیں تھا۔ دونوں خرکار تیزی سے باہر کو دوڑے۔ اُنہیں دور میدان میں اسلم دوڑتا ہوا نظر آیا۔ وہ بہت دُور جا چکا تھا۔ دونوں پھُرتی سے اپنی جیپ میں سوار

ہوئے اور جیپ اسٹارٹ کر کے اُس کا رُخ اسلم کی طرف کر دیا۔ جیپ تیز رفتاری سے اسلم کی جانب دوڑنے لگی۔

اسلم گھنے جنگل کی طرف دوڑ رہا تھا، جنگل اب اُس سے چند قدم کے فاصلے پر تھا اور یہ فاصلہ اُس نے پلک جھپکتے میں طے کر لیا۔ وہ جنگل میں داخل ہو گیا۔ اسلم نے اپنے تعاقب میں آنے والی اس جیپ کو دیکھ لیا تھا اور اسے یقین تھا کہ جیپ جنگل کے اندر نہیں آ سکتی۔ اُس نے سوچا کہ اگر کسی طرح اِس جیپ پر قبضہ ہو جائے تو پھر وہ آسانی سے یہاں سے دُور نکل سکتا ہے مگر یہ ایک مُشکل کام تھا۔

جیپ جنگل کے کنارے پر آ کر رُک گئی تھی اور اُس میں سے وہ دونوں خر کار چھلانگیں لگا کر نیچے اُترے۔ اُن کے ہاتھوں میں بندوقیں تھیں۔ وہ جنگل میں داخل ہو گئے اور اسلم کو تلاش کرنے لگے۔ اسلم نے اُنہیں دیکھ لیا تھا۔ وہ اب اُنہیں چکمہ دینے کی کوئی ترکیب سوچ رہا تھا۔ پھر اُس کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ اُس کے ذہن میں ایک بہت پرانی ترکیب آ گئی تھی۔ اُس نے جلدی سے زمین پر

پڑے ہوئے چند چھوٹے چھوٹے پتھّر اٹھائے اور پھر پھُرتی سے ایک گھنے درخت پر چڑھ گیا۔ وہ اوپر پہنچ کر شاخوں میں چھُپ گیا اور ان دونوں کے قریب آنے کا انتظار کرنے لگا۔

جلد ہی وہ دونوں اُسے نظر آ گئے۔ ان کے ہاتھوں میں بندوقیں تھیں اور وہ شکاری کتّوں کی طرح اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے اُسے تلاش کر رہے تھے۔ وہ درخت کے نیچے آ کر رُک گئے۔ اسلم نے اپنی سانس تک روک لیا۔ پھر اُس نے ایک پتھّر اپنی جیب سے نکالا اور اسے پوری قوّت سے دائیں طرف پھینکا۔ پتھّر دور گھنی شاخوں سے ٹکرا کر زمین پر آ گرا۔ اور وہاں شاخوں میں جیسے ہلچل سی مچ گئی۔ دونوں خر کار چونک کر اُس طرف دیکھنے لگے۔ پھر وہ تیزی سے اُس طرف بھاگے۔ انہیں یقین ہو گیا تھا کہ اسلم وہاں جھاڑیوں اور شاخوں میں چھُپا ہو گا۔

اسلم نے ایک پتھّر اور اُٹھایا اور اُسے بھی اُس سمت میں پھینکا۔ وہ اُس جگہ سے چند فیٹ دور جا کر ِگرا۔ اِس کے بعد اسلم جلدی سے درخت سے نیچے اترا اور پھر اُس

نے گاڑی کی طرف دوڑ لگا دی۔ جلد ہی وہ جیب کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی دیکھ کر اُسے اطمینان ہوا کہ چابی اگنیشن میں لگی تھی۔ اس نے جیپ اسٹارٹ کی اور پھر اسٹیئرنگ سنبھال کر اس نے جیب کو آگے بڑھایا۔ جیپ ایک جھٹکے سے آگے بڑھی۔ اسلم نے اسٹیئرنگ گھما کر اُس کا رُخ جنگل سے مخالف سمت میں کر دیا اور پھر ایکسی لیٹر پر اُس کے پاؤں کا دباؤ بڑھتا رہا۔

وہ مکمّل مہارت کے ساتھ جیپ ڈرائیو کر رہا تھا۔ اُسے یہ خطرہ تو تھا کہ کہیں جیپ بے قابو نہ ہو جائے مگر اِس وقت وہ یہ خطرہ مول لینے پر مجبور تھا۔ اتنی تیز رفتاری سے اُس نے کبھی کوئی گاڑی نہیں چلائی تھی۔ ورکشاپ میں جہاں وہ کام کرتا تھا جب بھی کبھی کسی گاڑی کی ٹرائی لیتا تو زیادہ سے زیادہ رفتار چالیس پچاس کلومیٹر رکھتا تھا، اور اب جیپ کی رفتار سترّ کلومیٹر سے بھی اوپر تھی۔ پھر آہستہ آہستہ اسلم کے حواس بحال ہونے لگے۔ اُسے یقین ہو گیا کہ اب وہ خرکاروں کے چُنگل سے بچ نکلا ہے۔ اِس احساس کے ہوتے ہی اُسے خوشی کا احساس ہوا اور اس نے

جیپ کی رفتار کم کرنی شروع کر دی۔ ابھی تک وہ پہاڑی راستے پر جا رہا تھا۔ دور دور تک پہاڑی چٹّانوں کا سِلسِلہ پھیلا ہوا تھا اور اُن کے درمیان یہ ایک لمبی سی پتھّریلی سڑک تھی جس پر وہ گاڑی کو بھگائے لیے جا رہا تھا۔

پھر اُس نے جیپ کی رفتار چالیس کلومیٹر کر دی۔ جیپ ہچکولے کھاتی، آگے بڑھتی رہی۔ دھوپ میں تیزی آگئی تھی اور اسلم سوچ رہا تھا کہ وہ جلد سے جلد کسی قصبے یا کسی شہر میں پہنچ جائے تاکہ وہاں پولیس سے رابطہ قائم کر کے وہ ان خرکاروں کو گرفتار کرانے کی کوشش کرے۔ اُسے سلیم بہت یاد آ رہا تھا۔ افسوس کہ وہ اُسے ساتھ نہیں لا سکا۔ لیکن یہی بہت تھا کہ وہ اُن کے ہاتھوں سے بچ نکلا تھا۔ اب کم سے کم وہ اِن لڑکوں کی آزادی کے لیے بھاگ دوڑ تو کر ہی سکتا تھا۔

وہ انھی خیالات میں جیپ چلا رہا تھا کہ اچانک ایک فائر ہوا اور اُس کے ساتھ ہی جیپ اُس کے قابو سے باہر ہو گئی۔ اُس کا ٹائر پھٹ گیا تھا۔ اسٹیئرنگ پر اس کے

ہاتھ لرز اُٹھے۔ جیپ تیزی سے اُچھل کر ایک چٹّان کی طرف بڑھی۔ اسلم نے پوری طاقت سے بریک لگائے اور اُس کی قسمت ہی اچھّی تھی کہ جیپ اُس چٹّان سے چند فیٹ دور ہی رُک گئی۔ ورنہ جیپ چٹّان سے ٹکرا کر اُلٹ سکتی تھی اور اس حادثے میں اُس کی جان بھی جا سکتی تھی۔

جیپ کے رُکتے ہی اچانک چاروں طرف سے آٹھ دس نقاب پوش ڈاکو نکلے اور اُسے گھیرے میں لے لیا۔ اُن کے ہاتھوں میں بندوقیں اور کلہاڑیاں تھیں اور وہ سب کالی شلوار قمیص میں ملبوس تھے۔ چہرے پر جو نقاب تھے وہ بھی کالی تھیں۔ اسلم انہیں دیکھ کر خوف زدہ ہو گیا۔ اُس کی ہمّت جیسے جواب دے گئی اور اُس کا جسم ہولے ہولے کانپنے لگا۔ وہ سچ مچ دہشت زدہ ہو گیا تھا۔ ایک ڈاکو نے اُسے نیچے اُترنے کا اشارہ کیا۔

وہ بغیر کُچھ کہے نیچے اُتر آیا۔ ایک ڈاکو نے سخت لہجے میں کہا۔ ”اگر کوئی حرکت کی تو نقصان اٹھاؤ گے۔“

وہ سب اُسے گھیرے میں لے کر ایک طرف کو چلے۔ اسلم ڈگمگاتے قدموں کے ساتھ اُن کے ساتھ چلنے لگا۔ جلد ہی وہ ایک غار میں پہنچ گئے۔ یہ ایک بہت بڑا غار تھا جس میں پچاس ساٹھ آدمی آرام سے رہ سکتے تھے۔ غار کے ایک طرف ایک چھوٹا سا کمرا بنا ہوا تھا۔ ایک طرف کونے میں کھانے پینے کا سامان اور چولہا وغیرہ رکھا ہوا تھا۔ غار میں پہلے سے بھی کُچھ ڈاکو موجود تھے۔ وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ ایک اجنبی لڑکے کو دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔

ایک ڈاکو نے پوچھا۔ ”شیدے یہ کون ہے۔ کہاں سے پکڑ لائے؟“

شیدے نے کہا۔ ”ابھی پتا چل جائے گا۔ یہ ہمارے علاقے میں کیوں آیا تھا؟“

”کہیں یہ بھی پولیس کا مخبر نہ ہو۔ سُنا ہے پولیس بڑی سرگرمی سے اِس علاقے میں ہماری تلاش میں ہے۔“ ایک دوسرے ڈاکو نے کہا۔

”ہاں ہو سکتا ہے۔ ابھی سب معلوم ہو جائے گا۔ جاؤ فقیرے! سردار کو خبر کر

دو۔“

فقیرا تیزی سے اُس کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اُس نے کمرے کے دروازے پر پہنچ کر آہستہ سے دستک دی اور کہا۔ ”سردار، سردار، ایک اجنبی لڑکے کو پکڑا ہے۔ کہیں وہ پولیس کا مُخبر نہ ہو۔“

اندر سے سردار کی آواز آئی۔ ”ٹھیک ہے۔ میں آرہا ہوں۔“

اس کے ساتھ ہی کمرے کا دروازہ کھُلا اور سردار باہر نکلا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اُس طرف آیا جہاں بہت سارے ڈاکو جمع تھے اور اُن کے درمیان میں اسم موجود تھا۔ خوف زدہ اور سہما ہوا۔

سب نے اُس کے لیے راستہ چھوڑ دیا۔ سردار اسلم کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ اور پھر وہ اسلم کو بغور دیکھتے ہوئے بھاری آواز میں بولا۔ ”لڑکے، سچ سچ بتا کون ہے تو، اگر تو نے جھوٹ بولا تو تُجھے گولی مار کر یہیں دفن کر دیں گے۔“

اسلم نے خوف زدہ آواز میں کہا۔ ”وہ، جی میرا نام اسلم ہے۔ میں تو وہاں سے بیگار کیمپ سے بھاگا ہوں جی۔“

”تو جھوٹ بولتا ہے، یہ جیپ تیرے پاس کہاں سے آئی۔“ سردار نے گرج دار آواز میں کہا۔

اسلم جلدی سے بولا۔ ”وہ، وہ جی یہ اُن کی ہی جیپ ہے۔ وہ مجُھے پکڑنے آئے تو میں اُنہیں دھوکا دے کر یہ لے آیا؟“

”تُو تو بڑا چالاک لڑکا ہے۔“ سردار نے کہا۔

اتنے میں شیدا ڈاکو آگے بڑھا اور کہا۔ ”سردار اگر حکم ہو تو اُن خرکاروں سے اِس لڑکے کا سودا کرلیں۔ اچھّے پیسے مل جائیں گے؟“

”ہوں، ٹھیک ہے شیدے، جا تُو اُنہیں خبر کر دے اور اِسے باندھ کر بٹھا دو۔“

اسلم کا دِل ایک دم رونے کو چاہا۔ وہ ایک مرتبہ پھر خطرناک لوگوں کے چُنگل

میں پھنس گیا تھا اور یہ لوگ اب اُسے دوبارہ اُن خرکاروں کے ہاتھ بیچ رہے تھے۔ اُسے اپنی بدنصیبی پر رونا آگیا اور اُس کی سے آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

دو ڈاکوؤں نے اُسے باندھ دیا۔ پھر اچانک شیدا اڈا کو دوڑتا ہوا آیا۔

"سردار، سردار، پولیس۔۔۔۔پولیس آگئی۔" وہ چیخا۔

سردار نے کہا۔ "کیا بکتے ہو۔ پولیس کیسے آسکتی ہے؟"

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔ میں نے ایک پولیس پارٹی کو اِس طرف آتے ہوئے دیکھا ہے۔"

"اچھّا، تو پھر یہاں سے بھاگنے کی کوشش کرو۔ جنوبی پہاڑیوں تک پہنچنے کی کوشش کرنا۔" سردار نے کہا۔ لیکن ابھی وہ پوری طرح سنبھلنے بھی نہیں پائے تھے کہ غار کے دہانے پر پولیس کے کئی سپاہی نظر آئے۔ سب سے آگے ایک پولیس انسپکٹر تھا۔ اُس نے چیخ کر کہا۔ "خبردار، اپنی جگہ کوئی حرکت نہ کرے۔

ورنہ ہم گولی مار دیں گے۔"

ڈاکو ہکّا بکّارہ گئے۔ اُنہیں اپنے ہتھیار اُٹھانے کی بھی مہلت نہیں ملی۔ پولیس کے سپاہیوں نے اُن سب کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ اور پھر سب کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دی گئیں۔ اُسی وقت ایک پولیس کے سپاہی کی نظر اسلم پر پڑی۔ اُس نے اُسے رسّوں سے آزاد کیا اور اپنے افسر کے پاس لے گیا۔ پولیس افسر نے اسلم کو غور سے دیکھا اور پھر حیران ہو کر بولا۔ "ارے، کیا تُم اسلم ہو؟"

اب اسلم نے بھی اُسے پہچان لیا تھا۔ وہ اکبر علی تھا۔ انسپکٹر اکبر علی خان جو ایک رات اسمگلروں سے بچنے کے لیے اُن کے گھر میں آ گھُسا تھا۔

اکبر نے جلدی سے اُٹھ کر اسلم کو گلے لگایا۔ اسلم بھی اُس سے لپٹ گیا۔

انسپکٹر اکبر علی خان نے اسلم سے پوچھا کہ وہ کب سے اِن کی قید میں تھا۔ اسلم نے اپنی تمام کہانی اُسے سُنائی اور کہا۔ "سلیم ابھی تک اُن خرکاروں کی قید میں ہے۔ پتا

نہیں وہ لوگ اب انہیں کہاں لے گئے ہوں گے۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اکبر نے اُسے تسلّی دیتے ہوئے کہا: تم فکر مت کرو، تم نے مُجھے بتا دیا۔ سمجھ لو اب سب پریشانیاں ختم میں اُن تمام لوگوں کو اِن ظالم لوگوں کے چُنگل سے آزاد کراؤں گا۔"

اسلم نے کہا۔ "دیر مت کیجئے، پتا نہیں وہ اُنہیں کہاں چھُپا دیں۔"

اکبر نے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ پھر ہم ابھی چلتے ہیں۔ میں ذرا اِن ڈاکوؤں کا بندوبست کر دوں۔"

یہ کہہ کر اُس نے کُچھ پولیس والوں سے کہا کہ وہ اِن تمام ڈاکوؤں کو یہاں کمرے میں بند کر دیں اور سخت پہرا دیں۔ ہمیں ابھی ایک اور مشن پر جانا ہے۔ ہمیں اُن سب بچّوں کو آزاد کروانا ہے اور اُن خرکاروں کو عبرت ناک سزا دینی ہے۔

تمام ڈاکوؤں کو کمرے میں بند کر دیا گیا اور اُن کے اسلحے پر قبضہ کر کے پولیس

والے وہاں پہرا دینے لگے۔ باقی پولیس والے نئے مشن کی تیّاری کرنے لگے۔

اسلم نے انسپکٹر اکبر سے پوچھا۔ ”آپ اچانک یہاں کیسے پہنچ گئے؟“

انسپکٹر اکبر نے کہا۔ ”میں کئی دِنوں سے اِن علاقوں کی نگرانی کر رہا تھا۔ مُجھے خبر ملی تھی کہ یہاں سے اسمگلنگ کا مال سپلائی ہوتا ہے۔ اِس کے علاوہ یہاں ڈاکوؤں کے اڈّوں کا بھی پتا چلا تھا جو اِن اسمگلروں کی مدد کرتے ہیں اور اِن سے اپنا کمیشن وصول کرتے ہیں۔ آج میں اپنے سپاہیوں کے ساتھ انہی پہاڑی علاقوں میں روپوش تھا کہ مُجھے فائر کی آواز آئی۔ پھر میں نے ایک جیپ دیکھی جس کا ٹائر پھٹا ہوا تھا۔ جیپ دیکھ کر مُجھے اندازہ ہو گیا کہ ڈاکوؤں نے کسی اجنبی کو پکڑ لیا ہے۔ چناں چہ ہم لوگ نشانات تلاش کرتے ہوئے یہاں تک پہنچ گئے۔“

اسلم نے پوچھا۔ ”آپ کو جن اسمگلروں نے اغوا کر لیا تھا اور جن سے بچ کر آپ ہمارے یہاں آئے تھے اُن کا کیا ہوا؟“

انسپکٹر اکبر نے کہا۔ ”ان لوگوں کو میں نے گرفتار کر لیا تھا اور اُن کے تمام اڈّوں کو ختم کر ڈالا تھا۔“

”لیکن آپ نے سلطان کے سِلسلے میں کُچھ نہیں کیا۔“ اسلم نے شکایتی لہجے میں کہا۔

اکبر نے جواب دیا۔ ”میں نے اُس کی تلاش بند نہیں کی ہے اور جلد ہی اُس کے بارے میں کُچھ معلوم ہو جائے گا۔ تُم نے جو اُس کا حلیہ بتایا تھا میں نے اُس حلیے کے مطابق آرٹسٹ سے تصویر بنوا کر ہر جگہ روانہ کر دی تھی اور یہاں میرے ایک انسپکٹر دوست نے مجُھے بتایا کہ اِس حلیے کا آدمی اس علاقے میں اکثر نظر آتا ہے۔ مجُھے یقین ہے کہ وہ جلد ہی پکڑا جائے گا۔“

اسلم نے کہا۔ ”کاش اکبر بھائی آپ اسے جلد تلاش کر سکیں۔“

تھوڑی دیر بعد وہ سب اسلحے سے لیس گھوڑوں پر سوار ہو کر بیگار کیمپ کی طرف

جا رہے تھے۔ اسلم بھی ایک گھوڑے پر سوار تھا۔ اُسے گھڑ سواری کا زیادہ تجربہ نہیں تھا مگر پھر بھی وہ کسی نہ کسی طرح اُن کا ساتھ دیے جا رہا تھا۔

پھر وہ گھوڑوں کو دوڑاتے ہوئے جلد ہی اُس مقام پر پہنچ گئے جہاں بیگار کیمپ قائم تھا مگر وہاں اس وقت سنّاٹا پھیلا ہوا تھا۔ رات کی بارش کا پانی میدان میں کہیں کہیں جمع تھا۔ اسلم کی پریشانی میں اضافہ ہو گیا۔ اکبر نے کہا۔ ”کوئی بات نہیں، ہم اُسے جلد ہی ڈھونڈ نکالیں گے۔ وہ بچ کر کہیں نہیں جا سکتے۔“

پھر اس نے ایک سپاہی کو اشارہ کیا۔ وہ گھوڑے سے نیچے اُترا اور پھر گھوم پھر کر ایسے نشان تلاش کرنے لگا جن کی مدد سے وہ اُن کی سمت کا پتا چلا سکتے۔ جلد ہی اُسے کام یابی ہوئی۔ اس نے شمال کی طرف اشارہ کیا اور پھر سب کے گھوڑوں کا رُخ شمال کی طرف ہو گیا۔

اسلم کو احساس ہوا کہ رات وہ اِسی جانب سے فرار ہونے میں کام یاب ہوا تھا۔ سفر ایک مرتبہ پھر شروع ہوا۔ جلد ہی میدانی سِلسِلہ آ گیا اور اِس کے بعد گھنا

جنگل۔ وہی سپاہی دوبارہ نیچے اُترا۔ اُس نے گھوم پھر کر جنگل کے کنارے پر ان کے قدموں کے نشانات تلاش کرنے کی کوشش کی اور تب اسے ایک چھوٹی سی پگڈنڈی نظر آئی۔ اس پر پانی جمع تھا اور کہیں کہیں کیچڑ میں بہت سے پاؤں کے نشانات نظر آئے۔ وہ سب اس پگڈنڈی پر آگے بڑھے۔ اب وہ احتیاط کے ساتھ چل رہے تھے۔ اُن کے گھوڑے بھی بہت ہوشیار تھے اور اپنے اپنے سوار کے اشارے پر چل رہے تھے۔

وہ اُس پگڈنڈی پر ابھی تھوڑی ہی دور گئے ہوں گے کہ اچانک اُن پر فائرنگ شروع ہو گئی۔ وہ سب پھُرتی کے ساتھ گھوڑوں سے اُترے اور درختوں اور جھاڑیوں کے پیچھے پوزیشنیں لے لیں۔

اب وہ بھی جوابی فائرنگ کر رہے تھے۔ اسلم ایک درخت کے پیچھے چھُپا یہ خوفناک جنگ دیکھ رہا تھا۔ اُس نے زندگی میں کبھی اس طرح جنگ نہیں دیکھی تھی۔ دونوں طرف سے مسلسل فائر ہو رہے تھے۔ سارا جنگل گولیوں کی آوازوں

سے گونج رہا تھا۔ ہر طرف موت کے شعلے رقصاں تھے۔ کئی گولیاں تو اسلم کے سر پر سے گزریں اور بعض اُسی درخت کے تنے میں پیوست ہو گئیں جس کے پیچھے وہ چھُپا ہوا تھا۔

کافی دیر تک فائرنگ ہوتی رہی۔ پھر اکبر کے اشارے پر سپاہیوں نے دستی بم نکالے اور اُس طرف اچھال دیے۔ بموں کے دھماکوں سے ساری زمین لرز اُٹھی۔ تھوڑی دیر بعد دوسری طرف سے فائرنگ کا سِلسِلہ رُک گیا اور ایک دم خاموشی چھا گئی۔

اُنہوں نے کُچھ دیر انتظار کیا پھر وہ سب اُس طرف بڑھے۔ وہ سب بہت محتاط اور چوکنّے تھے۔ وہ تھوڑی دور ہی گئے تھے کہ اُنہیں ایک عمارت نظر آئی۔ وہ کافی پرانی عمارت تھی۔ یقیناً اِسی عمارت کے اندر سے فائرنگ ہو رہی تھی۔ عمارت کے کُچھ حصّے اُس وقت ٹوٹے ہوئے تھے جو دستی بموں کے دھماکوں ٹوٹے تھے۔

وہ محتاط انداز میں عمارت میں داخل ہوئے مگر وہاں اب سنّاٹا پھیلا ہوا تھا۔ صرف

چند لاشیں ہی پڑی تھیں۔ اِس کا مطلب تھا باقی لوگ وہاں سے فرار ہو گئے ہیں۔ اُنہوں نے ساری عمارت دیکھ ڈالی۔ پھر اُنہیں عمارت کے عقب میں ایک سُرنگ سی نظر آئی۔ عمارت کے پیچھے پہاڑی چٹّان دور تک چلی گئی تھی اور یہ سُرنگ اُسی پہاڑی چٹان کے اندر تھی۔

وہ سب اُس سُرنگ میں داخل ہو گئے۔ وہ کافی لمبی سُرنگ تھی جس میں اندھیرا بھی پھیلا ہوا تھا مگر جلد ہی اُنہیں روشنی نظر آئی۔ سُرنگ کا دہانہ قریب تھا۔ وہ جیسے ہی اُس دہانے کے قریب پہنچے اُنہیں کسی بھاری گاڑی کے انجن کے اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔ اِس کے ساتھ ہی دو تین اور انجن اسٹارٹ ہوئے۔

اکبر دوڑتا ہوا باہر نکلا۔ باہر ایک بہت بڑا میدان تھا اور اُسے وہاں ایک ٹرک اور دو جیپیں نظر آئیں۔ ٹرک آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا تھا۔ اس پر بہت سے بچّے سوار تھے۔ جیپیں بھی اُس کے پیچھے چلنے لگی تھیں۔

اکبر نے ایک دم بندوق سے ٹرک کے ٹائر کا نشانہ لیا اور فائر کر دیا۔ اُس کا نشانہ

بالکل صحیح جگہ پر لگا۔ ٹائر پھٹ گیا اور ٹرک ڈگمگانے لگا۔ جیپوں پر موجود لوگوں نے اکبر پر فائرنگ شروع کر دی۔ اِس دوران سُرنگ میں سے دوسرے سپاہی بھی نکل آئے۔ اُنہوں نے بھی جیپوں کا نشانہ لے کر فائر کیے۔ جیپوں کے ٹائر بھی پھٹ گئے اور اُنہیں مجبوراً جیپوں کو روکنا پڑا۔ ٹرک بھی رُک چُکا تھا۔

اُن پر سے خرکار اُتر کر بھاگنے لگے مگر اکبر اور پولیس کے سپاہیوں نے اُنہیں چاروں طرف سے گھیر لیا۔ اُنہوں نے تھوڑی دیر تک مُقابلہ کیا مگر جلد ہی ہار مان لی، کیوں کہ وہ کھُلی جگہ پر تھے۔ اُن سب نے اپنے ہتھیار پھینک دیے اور خود کو پولیس کے حوالے کر دیا۔

اسلم دوڑ کر ٹرک کی طرف گیا۔ اُس میں موجود لڑکے چھلانگیں مار مار کر نیچے کودنے لگے۔ اسلم نے سلیم کو تلاش کیا اور پھر اُس سے لپٹ گیا۔ اُس نے کہا۔ "مبارک ہو۔ ہم سب آزاد ہو گئے۔"

لڑکے سب خوشی سے ناچ رہے تھے اور ایک دوسرے سے گلے مل رہے تھے۔

آج کا دِن اُن کے لیے بہت بڑی خوشی کا دِن تھا۔ وہ آزاد ہو گئے تھے۔ آزادی کی نعمت اُنہیں دوبارہ میسّر آگئی تھی اور یہ سب کُچھ اسلم کی وجہ سے ہوا تھا۔ اُنہوں نے اسلم کا شکریہ ادا کیا اور اظہارِ عقیدت کے طور پر اُسے اپنے کاندھوں پر اٹھا لیا۔

اِن سب خرکاروں کو گرفتار کر کے انسپکٹر اکبر کے سامنے پیش کیا۔ جب اسلم وہاں پہنچا تو اکبر خرکاروں کے سرغنہ سے گُفت گُو کر رہا تھا۔ وہ ایک لحیم شحیم آدمی تھا۔ اسلم اُس کے چہرے کو دیکھنے لگا اور پھر جیسے اُس کے ذہن میں دھماکے سے ہونے لگے۔ وہ اِس چہرے کو کبھی نہیں بھول سکتا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُسے گھورنے لگا۔ اُسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ پھر وہ بُڑبُڑایا: "یہ۔۔۔۔ یہ تو سلطان ہے۔ سلطان چاچا، میرے ابّو کا قاتل!"

پھر اُس کی آنکھوں سے شُعلے سے برسنے لگے۔ اُس کے ہاتھوں کی مُٹھّیاں بھنچ سی گئیں۔ اور پھر وہ بے اختیار اُس پر ٹوٹ پڑا۔ اکبر ارے ارے کرتا رہ گیا۔

سلطان اسلم کے دھکّے سے نیچے گِر پڑا۔ اسلم سلطان پر مُکّے برسا رہا تھا۔ اور چیخ رہا تھا:

”یہ، یہ قاتل ہے۔ میں اِسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ اِس نے میرے ابّو کو قتل کیا تھا۔ یہ میرے ابّو کا قاتل ہے۔“

سلطان اِس اچانک حملے سے حواس باختہ ہو گیا تھا۔ اکبر اور سپاہیوں نے اسلم کو اُس سے الگ کیا۔ اسلم کا سارا بدن غصّے سے کانپ رہا تھا۔ اور اُس کے منہ سے جھاگ نکل رہے تھے۔

اکبر اُسے پُر سکون رہنے کی تلقین کرنے لگا۔ پھر اکبر کے پوچھنے پر اسلم نے بتایا۔ ”یہ وہی ہے، سلطان جس نے میرے ابّو کو قتل کر دیا تھا۔“

اکبر یہ سُن کر چونک پڑا۔ اُس نے سُلطان کی طرف دیکھا اور پھر کہا: ”ٹھیک ہے اسم۔ اِسے اِس کی سزا ضرور ملے گی۔ اِس کے بعد وہ ایک بار پھر ڈاکوؤں کے غار

کی طرف واپس چل دیے۔ سب بچّوں کو ٹرک میں بٹھایا گیا۔ ٹرک کا ٹائر بدل دیا گیا تھا۔ جیپوں کے ٹائر بھی بدل دیے گئے تھے اور اُن خرکاروں کو ایک جیپ میں باندھ کر بِٹھا دیا تھا۔ وہ تعداد میں سات تھے۔ جلد ہی وہ اِس غار میں پہنچ گئے۔

اکبر نے سلطان کو ایک ستون سے باندھ دیا اور پھر اُس سے کہا:

”تم ایک ظالم اور بہت لالچی آدمی ہو۔ تُم نے ایک دوست کو دھوکا دیا اور اُسے قتل کر ڈالا حالاں کہ وہ تمھیں اُس خزانے میں سے آدھا حصّہ دے رہا تھا مگر تُم لالچی اور حریص بن گئے اور تمام خزانہ حاصل کرنے کے لیے اپنے عزیز دوست کو ختم کر ڈالا۔ تمھیں اِس کی سزا ضرور ملے گی۔ مگر پہلے یہ بتاؤ کہ وہ خزانہ کہاں ہے۔ مجُھے یقین ہے کہ تُم نے ابھی تک اُسے خرچ نہیں کیا ہو گا۔“

سلطان نے غرّاتے ہوئے کہا۔ ”میرے پاس کوئی خزانہ نہیں ہے۔“

یہ سُن کر اکبر نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے کوڑے سے اُس کی پٹائی شروع کر دی۔

سلطان کُچھ دیر تو ضبط کرتا رہا۔ پھر اُس کی چیخیں نکل گئیں لیکن اِس کے باوجود وہ خزانے کے بارے میں بتانے پر راضی نہیں تھا۔ آخر اکبر نے اپنے ایک ساتھی سے کہا۔ ”رسول بخش، ذرا آگ جلاؤ اور سلاخیں گرم کرو۔۔۔۔ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ کس طرح زبان نہیں کھولے گا۔“

رسول بخش جلدی سے آگ جلانے لگا۔ سلطان کی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں تھیں۔ اور وہ مسلسل رسول بخش کو دیکھ رہا تھا۔ اُس نے اپنے ہونٹ مضبوطی سے بھینچ رکھے تھے۔ جلد ہی سلاخیں گرم ہو کر دہکنے لگیں۔ رسول بخش سلاخیں پکڑے ہوئے اکبر کے پاس آیا۔

اکبر نے ایک سلاخ ہاتھ میں پکڑی اور پھر اُس کا دہکتا ہوا سِرا سُلطان کی آنکھوں کے قریب لایا۔ سلطان نے دہشت زدہ ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔

اکبر نے کہا۔ ”اب بھی وقت ہے، بتاؤ وہ خزانہ کہاں ہے۔ ورنہ تمہارا سارا جسم گرم سلاخوں سے داغ دیا جائے گا۔“

سلطان پھر بھی خاموش رہا۔ اکبر نے ایک دم سُلاخ اُس کے ہاتھ پر لگا دی اور سلطان کی چیخیں نکل گئیں۔ اِس کے بعد تو دوسری سلاخ لگانے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ سلطان نے بتایا کہ وہ خزانہ اُسی عمارت میں محفوظ ہے۔ البتّہ اُس میں سے اُس نے چند زیورات فروخت کر دیے تھے۔ باقی سارا خزانہ ویسا کا ویسا رکھا ہے۔ اُس نے پوری تفصیل سے اُس جگہ کی نشان دہی کی اور اکبر نے دو تین ساتھیوں کو فوراً وہاں روانہ کیا۔ وہ جیپ لے کر روانہ ہو گئے۔

چند گھنٹوں بعد وہ خزانہ اسلم کے سامنے بکھرا پڑا تھا جس کی تلاش میں اُس کے ابّو گئے تھے اور پھر کبھی واپس لوٹ کر نہیں آئے تھے۔ اُس خزانے نے اُن کے ابّو کو چھین لیا تھا۔ اکبر نے کہا۔ ”اسلم اب یہ خزانہ تمہارا ہے۔ مُجھے خوشی ہے کہ میں تمہارے کسی کام آیا۔ اب تُم جو چاہو اِس خزانے کا کر سکتے ہو۔“

اسلم نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”اکبر بھائی، میں اِس خزانے کا کیا کروں گا۔ یہ آپ رکھ لیں۔ میں اِسے نہیں لے سکتا۔ میرے ابّو اِسی کی وجہ سے مارے گئے

تھے۔ میں یہ نہیں لوں گا۔ مُجھے اِس کی ضرورت نہیں ہے اکبر بھائی۔ یہ آپ ہی لے لیں۔"

اکبر نے کہا۔ "نہیں اسلم، ایسا مت سوچو، اِس کی مُجھ سے زیادہ ضرورت تو تُم لوگوں کو ہے۔ اب تُم کام مت کرنا بلکہ مزید تعلیم حاصل کرنا۔ تُم نے مُجھ سے کہا تھا کہ تُم ڈاکٹر بنو گے۔ اب تُم ڈاکٹر بن سکتے ہو۔ یہ خزانہ تمھارے کام آئے گا۔ اس پر تمھارا ہی حق ہے۔" اسلم خاموش رہا۔ وہ پتا نہیں کیوں بہت اداس ہو گیا تھا۔

اُس رات غار میں خوب جشن منایا گیا۔ سب بچّے بہت خوش تھے لیکن وہ سب اپنے اپنے گھر جانے کے لیے بہت بے چین تھے۔ ان سب کو امّی، ابّو، بہن، بھائی سب بہت یاد آ رہے تھے۔ اکبر نے سب سے وعدہ کیا کہ وہ صُبح ہوتے ہی اُنہیں شہر پہنچا دے گا۔ چناں چہ صُبح اٹھ کر سب نے ناشتا کیا اور پھر سب لڑکوں کو جیپوں میں بِٹھا کر شہر کی طرف روانہ ہوئے۔ سلطان اور اُس کے ساتھیوں کو بھی

ایک گاڑی میں باندھ کر بِٹھا دیا گیا۔

شہر وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ دو گھنٹے کی مسافت کے بعد وہ شہر میں داخل ہو گئے۔

تمام ضروری کارروائی نمٹانے کے بعد اسلم اور سلیم اپنے گھر کے لیے روانہ ہوئے۔ بہت دِنوں بعد وہ آزاد فضا میں سانس لے رہے تھے۔ اور اب اپنے گھر کی طرف جاتے ہوئے وہ بہت خوش تھے۔ اسلم کے کاندھے سے ایک کینوس کا تھیلا لٹکا ہوا تھا۔ اُس تھیلے میں اکبر نے وہ خزانہ بھر دیا تھا جس کی تلاش میں اُس کے ابّو اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ اسلم یہ خزانہ لینا نہیں چاہتا تھا مگر اکبر نے زبردستی اُسے تھما دیا تھا۔ اور کہا تھا کہ اُن کے کام آئے گا اور یوں بھی اُس کے ابّو اِسی کی وجہ سے مارے گئے تھے۔ اُنہیں اُس کی بڑی تلاش تھی۔ بڑی آرزو تھی اور اب ان کی روح کو سکون مل جائے گا کیوں کہ یہ اُن کی اولاد کے پاس پہنچ گیا ہے۔

جب اسلم اور سلم اپنے گھر میں داخل ہوئے تو اُن کی امّی پلنگ پر لیٹی تھیں۔ اور صفیہ اُن کے سرہانے بیٹھی اُن کا سر دبا رہی تھی۔ صفیہ کی نظر جیسے ہی اُن دونوں پر پڑی وہ ایک دم پلنگ سے اُتری اور پھر ”بھائی آ گئے، امّی بھائی آ گئے، کہتی ہوئی اُن دونوں کی طرف دوڑی اور اُن کے قریب پہنچ کر دونوں سے لپٹ گئی۔

رضیہ بیگم بھی ایک دم پلنگ پر اُٹھ بیٹھیں۔ ”میرے بچّو، میرے لال۔“ اُنہوں نے کہا اور دونوں ہاتھ پھیلا کر پلنگ سے اُترنے کی کوشش کی۔ مگر کمزوری کی وجہ سے نہیں اُٹھا سکیں۔ وہ بہت نحیف اور کم زور ہو چکی تھیں۔ اسلم اور سلیم دوڑ کر اُن کے پاس آئے اور اُن سے لپٹ گئے۔

رضیہ بیگم کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ گئے اور وہ رو پڑیں۔

سلیم نے کہا۔ ”امّی آپ رو رہی ہیں۔ اب تو ہم آ گئے ہیں۔“

رضیہ بیگم نے آنسو پونچھتے ہوئے بھرّائی آواز میں کہا۔ ”نہیں بیٹے، یہ تو خوشی کے

آنسو ہیں۔ میں بہت خوش ہوں۔ اللہ نے میری دُعا سُن لی۔"

اسلم اور سلیم کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اُنہیں کوئی بہت بڑا خزانہ مل گیا ہو۔ سچ ہے ماں کی محبّت سے بڑھ کر کوئی خزانہ نہیں ہوتا۔

جب اسلم نے اپنی امّی کو اِس خزانے کے بارے میں بتایا تو اُنہوں نے کہا:

"اسلم بیٹا، یہ خزانہ ہم نہیں لیں گے۔ تمہارے ابّو سے ایک غَلَطی ہوئی تھی۔ اگر وہ مُجھے اُس وقت بتا دیتے تو میں کبھی بھی اُنہیں ایسا نہیں کرنے دیتی۔ اُنہوں نے ایک پوسٹ مین ہو کر امانت میں خیانت کی۔ پوسٹ مین تو رازوں کا امین ہوتا ہے۔ امانتوں کو سنبھال کر اُس کے اصل مالک تک پہنچاتا ہے مگر تمہارے ابّو سے غَلَطی ہو گئی۔ اللہ اُن کی غَلَطی کو معاف کرے۔ مگر اب میں اپنی اولاد کو یہ غَلَطی نہیں کرنے دوں گی۔ ہمیں اِس خزانے سے کوئی غرض نہیں۔ یہ ہمارا نہیں۔ اب یہ تمہارا فرض ہے کہ تُم اِسے اِس کے اصل حق دار تک پہنچا دو۔ پولیس کے پاس وہ ڈائری اب تک محفوظ ہو گی۔ تُم اُس ڈائری میں سے پتا معلوم

کر کے اُس شخص کو تلاش کرو اور اُسے یہ خزانہ دے آؤ۔ ٹھیک ہے نا بیٹا!“

اسلم نے کہا۔ ”ہاں امّی آپ صحیح کہہ رہی ہیں۔ اِس خزانے پر ہمارا کوئی حق نہیں ہے۔ میں بھی اِسے نہیں لینا چاہتا۔ میں اکبر بھائی سے کہہ کر پتا کر لوں گا اور یہ سارا خزانہ اُسے دے آؤں گا۔“

دوسرے دِن وہ انسپکٹر اکبر سے ملنے گیا اور اُسے ساری بات سمجھائی۔ اکبر نے فوراً ریکارڈ روم سے وہ ڈائری نکلوائی اور پھر وہ اسلم کو دیتے ہوئے کہا۔ ”یہ لو، اپنے پاس رکھو۔ اِس میں اُس شخص کا نام پتا موجود ہے۔ اگر تُم کہو تو میں بھی تمہارے ساتھ چلوں۔“

اسم نے کہا۔ ”نہیں اکبر بھائی، میں اکیلا چلا جاؤں گا۔ آپ فکر نہ کریں۔“

اکبر نے کہا۔ ”تمہارے لیے ایک خوش خبری ہے۔ حکومت نے اِن خرکاروں اور ڈاکوؤں کی گرفتاری پر انعام رکھا تھا چونکہ یہ سب تمہاری وجہ سے پکڑے

گئے ہیں اِسی لیے اب یہ انعام تمہیں ملے گا۔"

اسلم حیرانی سے اکبر کی طرف دیکھ کر رہ گیا۔

اُسی شام وہ ڈائری پر لکھے ہوئے پتے پر جا پہنچا۔ اُس کے پاس وہی کینوس کا تھیلا تھا جس میں خزانہ موجود تھا۔ اسلم نے مکان پر پہنچ کر گھنٹی بجائی تو ایک شخص باہر نکلا۔ اسلم نے کہا۔ "جمال صاحب ہیں۔"

اُس شخص نے کہا۔ "میں ہی جمال ہوں۔ بولو بیٹا کیا کام ہے؟"

اسلم نے کہا۔ "انکل! آپ کی ایک امانت میرے پاس ہے۔ وہ پہنچانے آیا ہوں۔" جمال مرزا نے کہا۔ "اچھّا، آؤ اندر آ جاؤ۔"

وہ اسلم کو لے کر ڈرائنگ میں پہنچا۔ پھر ایک صوفے پر اسلم کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "ہاں اب بتاؤ کیا بات ہے۔ کون سی امانت ہے تمہارے پاس؟"

اسلم نے وہ تھیلا جمال مرزا کی طرف بڑھا دیا اور کہا:

”ہاں لیجئے انکل۔ یہ آپ کی امانت ہے۔“

جمال مرزا نے وہ تھیلا ہاتھ میں پکڑا اور پھر اُس کا مُنہ کھول کر اندر جھانکا۔ پھر وہ ایک دم بُری طرح سے چونک گیا۔ اُس کی آنکھوں میں شدید حیرانی تھی۔ اُس نے ہاتھ ڈال کر وہ قیمتی زیورات نکالے۔ پھر وہ حیرت کے عالم میں بولا۔ ”یہ سب کیا ہے بیٹا؟“ اُس کی آواز کپکپا رہی تھی۔

اسلم نے کہا۔ ”انکل! یہ سب کُچھ آپ کا ہے۔ مجُھے بہت افسوس ہے کہ میرے ابّو لالچ کا شکار ہو گئے اور آپ کی امانت میں خیانت کر ڈالی۔ مگر میں آج اپنے ابّو کی غَلَطی کی تلافی کرنے آیا ہوں۔“

اِس کے بعد اسلم نے تفصیل سے سب کُچھ حال مرزا کو بتا دیا اور وہ ڈائری بھی اُسے دِکھائی کہ جس کی وجہ سے یہ ساری صورتِ حال پیدا ہوئی تھی۔ جمال مرزا

نے وہ ڈائری دیکھی اور پھر اسلم کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”تُم ایک نیک اور اچھّے لڑکے ہو۔ میرے پاس اللہ کا دیا سب کُچھ ہے مگر میں اِس دُنیا میں بالکل تنہا ہوں۔ میرا کوئی بیٹا ہے اور نہ رشتے دار۔ آج سے تم میرے بیٹے ہو۔ میرے اپنے بیٹے۔“

یہ کہہ کر اُس نے اسلم کو اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔ اسلم کا دِل بھر آیا اور اُسے بے اختیار اپنے ابّو یاد آگئے۔ وہ بھی تو اِسی طرح اُسے پیار کرتے تھے۔ اُسے یوں لگا کہ جیسے اُس کے ابّو دوبارہ زندہ ہو گئے ہیں۔ اُسے محسوس ہوا کہ دُنیا میں سب سے بڑا خزانہ محبّت، خلوص اور پیار کا خزانہ ہے۔ بعد میں اسلم کے پوچھنے پر جمال مرزا نے بتایا کہ وہ چند دِن کے لیے اچانک ایک ضروری کام سے ہانگ کانگ چلا گیا تھا۔ بس اتنی جلدی اور اچانک جانا ہوا کہ کسی کو بھی بتا کر نہیں جا سکتا۔ کوئی دو ہفتے بعد واپسی ہوئی تو ہمسائے صدیقی صاحب نے بتایا کہ میری کوئی ڈاک آئی تھی۔ پوسٹ مین کئی دِن تک پریشان رہا پھر اُس کے بعد اُس پوسٹ مین کا پتا ہی نہیں چلا۔

اسلم سوچنے لگا۔ ”کاش آپ اُن دِنوں یہاں موجود ہوتے تو شاید یہ سب کُچھ نہ ہوتا۔ شاید میرے ابّو زندہ ہوتے۔ مگر اب کیا ہو سکتا ہے۔“

تھوڑی دیر بعد اسلم جب اپنے گھر لوٹ رہا تھا تو خود کو بہت ہلکا پھُلکا محسوس کر رہا تھا۔ جیسے اُس کے سر سے کوئی بہت بڑا بوجھ اُتر گیا ہو۔

ختم شد